نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

''بابر بیٹا، رکو تو، بات تو سنو...... بابی میری جان اس طرح ناراض ہو کر مت جاؤ...... دیکھو میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔'' ممی نے اسے پھر آواز دی تھی لیکن وہ رکا نہیں تھا۔ وہ تاسف سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں۔

انہیں بابر سے محبت تھی۔ وہ لے پالک بیٹا ہی نہیں بھانجا بھی تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا جب وہ اسے گھر لے کر آئی تھیں۔ گھر لانے سے پہلے بھی وہ انہیں دوسرے بھانجوں کے مقابلے میں زیادہ پیارا لگتا...... وہ جب بھی بہن کے گھر جاتیں تو وہ اُن کے پاس ہی جڑ کر بیٹھا رہتا۔ تب ایک روز انہوں نے اسے مانگ ہی لیا۔ گو کہ وہ کافی سمجھدار تھا جب وہ اسے گھر لائی تھیں۔ وہ رشتوں کو کسی حد تک سمجھتا اور پہچانتا تھا لیکن اس نے انہیں ممی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے نہیں کہا تھا لیکن انہیں اس کا ممی کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ جیسے بابر سچ مچ اُن کا ہی بیٹا ہو اور جب پہلی بار اس نے انہیں ممی کہا تھا اور ایمل کے ساتھ پارک میں جا کر کھیلنے کی اجازت مانگی تھی۔ تب سے ہی دل میں ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔ بابر اور ایمل کی شادی کی خواہش...... وہ دونوں ساتھ، ساتھ کھڑے بہت پیارے لگ رہے تھے...... ''اگر وہ بابر کے ساتھ ایمل کی شادی کر دیں تو ایمل ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی۔ ان کی نظروں کے سامنے۔'' بابر کو پارک میں جا کر کھیلنے کی اجازت دیتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اور پھر وقت کے ساتھ، ساتھ یہ خواہش پنپتی رہی۔ گو کرنل حامد نے اس کی اس خواہش کی کبھی پزیرائی نہیں کی...... اور وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال دیتے تھے۔

''یہ سب قبل از وقت ہے۔ وقت آنے پر دیکھا جائے گا، کون جانے بڑا ہو کر بابر کیا کرے گا۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا یا......؟''

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن انہیں یقین تھا کہ ان کی تربیت اور ان کے گھر کا ماحول بابر کو اپنے باپ سے قطعی مختلف شخصیت میں ڈھالے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ بابر نے شاندار نمبروں میں ایم بی اے کیا تھا اور تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک کمپنی میں جاب بھی کر لی تھی گو ان کی خواہش تھی کہ وہ کرنل حامد کے ساتھ کام کرے اور کرنل حامد نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ بابر کی ایجوکیشن سے بہت مطمئن تھے اور خود وہ تو بہت ہی خوش تھیں۔ بابر کے بھائیوں میں سے کوئی بھی بی اے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ بابر جاب کر رہا تھا اور اب ان کے دل میں بار، بار ایمل اور بابر کی شادی کی خواہش ابھرتی تھی۔ کم از کم وہ اس رشتے کا اعلان کرنا چاہتی تھیں اور اب کے کرنل حامد نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا سو ایک دن انہوں نے ایمل سے سرسری ساذکر کیا کہ وہ اور اس کے ڈیڈی اس کی شادی بابر سے کرنا چاہتے ہیں تو ایمل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''نہیں...... ہرگز نہیں، مجھے بابر بھائی سے شادی نہیں کرنی۔ اور نہ ہی میں نے کبھی ان کے متعلق اس طرح سوچا ہے۔''

''تو اب سوچ لو میری جان۔'' انہوں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن سوچا ضرور تھا کہ کیوں......؟ اور اس کیوں کا جواب بھی انہیں جلد مل گیا تھا جب انہوں نے باقاعدہ اس کی منگنی کے فنکشن کا پلان بنایا...... وہ اپنے کسی کلاس فیلو کو پسند کرتی تھی۔

''نہیں......''

انہیں ایمل کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اور وہ ایک شدید صدمے سے دوچار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے تو بابر اور ایمل کے حوالے سے بہت سارے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ ایمل ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یک بعد دیگرے کم عمری میں ہی فوت ہو جانے والے دو بیٹوں کی وجہ سے وہ ایمل کے لیے بہت حساس تھیں اور بابر سے شادی کی صورت میں وہ ہمیشہ اُن کی نظروں کے سامنے رہتی۔

''کیا تمہیں ہماری پسند پر اعتبار نہیں ہے۔ یقین کرو، بابر کے ساتھ تم بہت خوش رہو گی۔ وہ بہت اچھا ہے۔''

''یقیناً بابر بھائی بہت اچھے ہیں لیکن میں مدثر حسن سے محبت کرتی ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔ ''اور میں اس کے علاوہ کسی اور شخص کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھیں محبت کے جذبے سے دمک رہی تھیں اور لبوں پر کھلی مسکراہٹ دل میں چھپے جذبوں کو عیاں کرتی تھی۔

انہیں لگا جیسے یہ منظر پہلے بھی ان کی آنکھوں نے دیکھا اور پھر یہ الفاظ پہلے بھی ان کے کانوں نے سنے تھے۔

''بھائی پلیز آپ پاپا سے اور مما سے بات کریں ناں کہ میں ثمر حیات سے محبت کرتی ہوں اور میں اس کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔''

یہ فرح تھی فرحی...... ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے ان کی طرف دیکھتی ہوئی اور اس کی آنکھیں یوں ہی دمک رہی تھیں...... اور رخسار کسی اندرونی جذبے کی حدت سے دہک رہے تھے۔ انہوں نے ایک جھرجھری سی لے کر ایمل کی طرف دیکھا تھا جس کی آنکھیں اب بھی جگر، جگر کر رہی تھیں اور لبوں پر وہی مسکراہٹ سجی تھی۔

''ممی پلیز......!'' انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''آپ بابر بھائی کی فکر نہ کریں۔ ان کی شادی کسی اچھی لڑکی سے ہو جائے گی پر کوئی اور لڑکی کیوں...... مونا بھی تو ہے ناں میری فرینڈ...... کتنی پیاری اور کتنی اچھی ہے...... بس آپ ڈیڈی سے کہیں وہ ایک بار مدثر سے مل لیں...... وہ بہت اچھا ہے ممی بہت ہینڈسم بہت......'' لیکن وہ ایمل کی بات نہیں سن رہی تھیں۔ ان کے سامنے تو فرحی بیٹھی تھی ملتجی نظروں سے انہیں دیکھتی...... التجا کرتی۔

''بھائی پلیز آپ پاپا سے کہیں وہ ایک بار تو ثمر سے مل لیں۔ مجھے یقین ہے وہ اسے ریجیکٹ نہیں کر سکتے۔ وہ اتنا ذہین، اتنا اچھا ہے کہ پپا ایک بار اس سے مل لیے ناں......'' اس کی آنکھوں میں امید کے وہی دیے روشن تھے جنہوں نے اس وقت ایمل کی آنکھوں کو جگمگا رکھا تھا۔

''میں صرف ثمر کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں پھر بھی اگر وہ پپا کو پسند نہیں آیا تو......'' اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''اور کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے گی؟'' انہوں نے خوفزدہ ہو کر اپنی بیٹی ایمل کی طرف دیکھا تھا جو تقریباً وہی باتیں دہرا رہی تھیں جو اُن کی سماعتوں نے پہلے بھی سنی تھیں۔

اور پھر انہوں نے کرنل حامد کو قائل کر لیا کہ وہ ایک بار مدثر حسن سے مل لیں۔ ''کیا خبر وہ ہماری بیٹی کو ڈیزرو کرتا ہو۔'' اور کرنل حامد، مدثر حسن سے ملے تھے اور اس کے بابا جان سے بھی...... انہیں مدثر حسن پسند آیا تھا۔ ایک ویل ایجوکیٹڈ شریف خاندان کا لڑکا بظاہر اس میں رد کرنے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کے اسٹیٹس سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ایمل ان کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی وہ کیسے اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کر دیتے جس کے پاس اپنا ذاتی گھر تک نہیں تھا۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ ایمل کو وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں نہیں دے سکتا تھا جن کی وہ عادی تھی۔ اس نے تو کبھی کسی کمتر چیز پر کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ اس کی چوائس تو ہمیشہ اعلیٰ رہی تھی۔ وہ بھلا کیسے ایک متوسط گھرانے میں زندگی گزار سکتی تھی یہ کرنل حامد کا خیال تھا لیکن ایمل ایسا نہیں سمجھتی تھی...... اس کے نزدیک محبت میں ان ساری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کی بھیگی پلکیں سوجی آنکھیں......

''کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے؟'' انہوں نے خوفزدہ ہو کر ایک بار پھر سوچا تھا او۔ کیا ایمل بھی فرحی کی طرح......

اور انہوں نے کرنل حامد سے ایک بار پھر مدثر کے متعلق بات کی تھی وہ ایمل کی وکالت کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ ایمل تھی، ان کی اکلوتی بیٹی اور فرحی...... وہ ان کی بیٹی نہیں تھی وہ صرف فرحی تھی۔ کرنل حامد کی بہن اور یہ ایمل

تھی...... ان کی اپنی بیٹی...... پوزیشن ایک ہی تھی مگر رشتوں کے فرق سے کتنی بدل گئی تھی۔

''ایمل، مدثر کو پسند کرتی ہے حامد صاحب۔'' دبے لہجے اور دھیمی آواز میں انہوں نے بات شروع کی تھی۔

''ہاں جانتا ہوں...... لیکن ایمل ابھی ناسمجھ ہے، میں مدثر کو ایمل کے لیے موزوں نہیں سمجھتا...... اس کے پاس تو اپنا ذاتی گھر تک نہیں ہے پھر......''

''اس کے بابا جان نے بتایا تو تھا کہ انہوں نے پلاٹ خرید اہوا ہے گھر بھی بن جائے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمارے جتنے دولت مند نہیں ہیں اس میں اور کوئی برائی تو نہیں ہے۔'' انہوں نے وکالت کی۔

''پھر بھی میں ایمل کے لیے اسے پسند نہیں کرتا اور میں نے مبشر حسن صاحب سے معذرت کرلی ہے۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔ اور کسی خوف نے جیسے ان کے دل کو کسی فولادی پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

''نہیں، میں تاریخ کو دُہرانے نہیں دوں گی۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ ان چند دنوں میں انہوں نے جان لیا تھا کہ ایمل، مدثر کو کتنی شدت سے چاہتی ہے۔ ایمل نہ صرف شکل صورت میں ان کی نند فرحی سے مشابہ تھی بلکہ اس کی بے حد لاڈلی بھی تھی دونوں کی عمروں میں صرف تیرہ سال کا فرق تھا لیکن وہ ہر بات میں فرحی کی تقلید کرتی تھی۔ ان کی کئی عادات بھی ایک جیسی تھیں۔

''تو کیا ایمل بھی فرحی کی طرح......؟''

''نہیں۔'' کرنل حامد جیسے ان کے دل پر ابھرتی تحریر پڑھ رہے تھے۔

''ایمل کو میرا ہر فیصلہ قبول ہے۔ اس نے یہی کہا ہے مجھ سے وہ فرحی نہیں ہے کہ......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھیں۔ وہ نام جو وہ زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہی تھیں، کرنل حامد کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا تھا اور کتنے سالوں بعد اس گھر کے درودیوار نے فرحی کا نام سنا تھا۔

فرح...... کرنل حامد کی چھوٹی اور بے حد لاڈلی بہن جو ان سے اور آپی سے پورے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ آپی اور کرنل حامد جڑواں تھے اور اپنے سے پندرہ سال چھوٹی بہن کے بہت لاڈ اٹھاتے تھے۔ اور صرف وہی نہیں مما، پپا کی بھی وہ بے حد لاڈلی تھی اور آپی کی شادی کے بعد تو وہ کرنل حامد کے اور بھی قریب ہوگئی تھی ذرا، ذرا سی بات پر اس کے آنسو نکل آتے تھے اور کرنل حامد نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا۔ وہ (ایمل کی ممی) جب بیاہ کر آئی تھیں تو انہیں کرنل حامد کا فرحی کو اتنی زیادہ، اہمیت دینا کھلا تو تھا لیکن انہوں نے اپنے کسی طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ فرحی کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا سو فرحی ان کے گرد دیوانہ وار گھومتی تھی اور اپنے دل کی ہر بات ان سے ہی کہتی تھی اسے بقول حامد صاحب کے ان کی شکل میں آپی کا نعم البدل مل گیا تھا۔ ایمل کی آمد کے بعد انہیں خیال گزرا تھا کہ شاید اب فرحی کی اہمیت کچھ کم ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کرنل حامد اب بھی ہر ایک پر اسے ترجیح دیتے تھے اور شاید تب ہی ان کے اندر کہیں گہرائی میں فرحی کے لیے ایک گانٹھ پڑ گئی تھی لیکن وہ خود اس گانٹھ سے بے خبر تھیں۔

فرحی تیرہ سال کی تھی جب ایمل پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایمل کا نام اپنی فلسطینی دوست کے نام پر رکھنا چاہتی تھیں جو لندن میں ان کی پڑوسی ہونے کے ساتھ، ساتھ ان کی کلاس فیلو بھی تھی لیکن فرحی کو ایمل نام پسند تھا اور کرنل حامد نے فرحی کی پسند کو ترجیح دی تھی تب انہیں بہت برا لگا تھا اس لیے انہوں نے اسے چندا کے نک نیم سے بلانا شروع کر دیا تھا پھر گھر میں، باہر سب ہی اسے چندا کہہ کر بلانے لگے تھے۔ انہیں تو کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا کہ معمولی، معمولی باتوں نے ان کے دل میں فرحی کے لیے کتنا بغض بھر دیا ہے۔ اور اس کا اندازہ انہیں تب ہوا تھا جب پپا اور کرنل حامد نے ثمر حیات کے پروپوزل کو ریجیکٹ کر دیا تھا ان کے اندر ایک عجیب کمینی سی خوشی رقص کرنے لگی تھی۔ اپنی شادی کے گیارہ سالوں بعد انہوں نے پہلی بار فرحی کی کسی خواہش کو رد ہوتے دیکھا تھا۔ کرنل حامد نے کئی بار اس کی بات ٹال دی تھی

لیکن انہوں نے فرحی کی کبھی کوئی بات نہیں ٹالی تھی اور وہ اس کمینی سی خوشی کو دل میں چھپائے بظاہر اس کے آنسو پونچھتی رہی تھیں۔ اسے گلے لگا کر تسلی دیتی رہی تھیں اور وہ رو، رو کر کہہ رہی تھی۔

''میں ثمر کے سوا کسی دوسرے شخص کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ پپا نے مجھے جس کسی شخص کے ساتھ بھی بیاہا وہ کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو لیکن میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار پاؤں گی۔ دیکھ لیجیے گا، میں زیادہ دن جی نہیں پاؤں گی، مر جاؤں گی اور پھر سب روتے رہنا مجھے۔''

اور وہ سب روئے تو تھے اسے لیکن وہ مری نہیں تھی۔ ان سے دل کی ہر بات کرنے والی فرحی نے انہیں اپنے دل کا یہ بھید نہیں دیا تھا کہ وہ دل میں کیا ٹھانے بیٹھی ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مر جائے گی لیکن مرنے کے بجائے اس نے رات کے اندھیرے میں گھر چھوڑ دیا تھا اور مما، پپا، کرنل حامد سب کو جیسے زندہ درگور کر دیا تھا...... لیکن وہ بے حد مطمئن تھیں انہوں نے فرحی سے کبھی نفرت نہیں کی تھی لیکن اندر کہیں کوئی جیلسی تو تھی ہی۔ جب کرنل حامد فرحی کی موجودگی میں اسے اور ایمل کو نظر انداز کرتے تھے تو شاید اندر کہیں کوئی کانٹا سا چبھ جاتا تھا۔ اور شاید یہی چبھن تھی کہ انہوں نے اسے اسپتال کے گیٹ سے ہی بھگا دیا تھا۔ پپا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور فرحی پشیمان سی لوٹ آئی تھی۔ اپنی غلطی پر شرمندہ تھی۔ پپا سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی کچھ...... لیکن انہوں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا...... بلکہ انہوں نے اس معزز شخص کی بات بھی سن کر نظر انداز کر دی تھی جو بتا رہا تھا کہ فرحی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا اور وہ تو راستے سے ہی پلٹ آئی تھی اور بعد میں فرحی نے کتنے فون کیے تھے۔ روئی تھی، گڑگڑائی تھی لیکن انہوں نے اسے واپس نہیں آنے دیا۔ مما، پپا اور کرنل حامد سے بات نہیں کرنے دی۔

''تم ہمارے لیے مر چکی ہو فرحی۔'' وہ اس لمحے کتنی سفاک ہو چکی تھیں ورنہ اگر وہ مما، پپا سے بات کرتی تو کیا وہ اس کی ساری بات سن کر اسے معاف نہ کر دیتے...... لیکن وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ واپس آئے...... ہاں ان کے اندر یہی خواہش چھپی ہوئی تھی لیکن بظاہر انہوں نے اس سے کہا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو فرحی کہ تم یہاں آؤ اور حامد تمہیں قتل کر کے جیل چلے جائیں۔ پھانسی ہو جائے انہیں، خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔'' اور اس گھر کے در و دیوار تک فرحی کو بھول گئے...... پھر کسی نے اس گھر میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا...... ہاں جب تک مما زندہ رہیں وہ کبھی کبھار پپا سے کہتی تھیں۔

''ہماری بیٹی ایسی تو نہیں تھی ملک صاحب، کیا تھا اگر ہم ہی اس کی بات مان لیتے ثمر برا لڑکا تو نہیں تھا...... بس ہمارے طبقے سے نہیں تھا۔'' اور ایسے میں لحہ بھر کے لیے ان کے دل میں ندامت کا احساس جاگتا اور معدوم ہو جاتا...... پھر جب آپی بیوہ ہو کر واپس حامد ولا میں آئیں تو کتنی ہی بار انہوں نے پوچھا تھا۔

''کیا فرحی نے یہاں سے جانے کے بعد کبھی فون نہیں کیا بھابی...... کبھی مما اور پپا سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی...... کبھی معافی مانگنے کے لیے ہی سہی فون کیا ہو؟''

''نہیں......'' وہ نظریں چرا لیتی تھیں۔

''وہ اتنی کٹھور تو نہیں تھی اتنی سنگدل...... وہ تو سب سے بہت محبت کرتی تھی...... پھر کیسے اس نے ہم سب کا دل دکھایا۔'' ان کی پلکیں بھیگ جاتیں آواز بھرا جاتی...... پھر ہولے، ہولے انہوں نے بھی فرحی کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایمل ان کی لاڈلی تھی...... انہوں نے آپی سے کہا تھا کہ وہ کرنل حامد کو راضی کر لیں...... مدثر اتنا دولت مند نہیں تو کیا ہوا...... ہمارا سب کچھ ایمل ہی کا تو ہے۔ ہم ایمل کو وہ سب دے دیں گے جس کی ایمل کو ضرورت ہوگی۔ لیکن آپی بھی بھائی کو قائل نہیں کر سکی تھیں اور وہ اپنے خوف کو دل میں چھپائے بولائی، بولائی سی کبھی آپی کے پاس اور کبھی ایمل کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایمل کی بھیگی پلکیں سرخ آنکھیں دیکھ کر انہیں فرحی بہت یاد آتی۔

وہ اگر چاہتیں تو یہ گھر فرحی کے لیے شجرِ ممنوعہ نہ رہتا۔ فرحی لوٹ آتی تو سب کو اس کی بات کا یقین آ ہی جاتا۔ ''یا اللہ میری غلطی کی سزا میری بچی کو نہ دینا۔'' ہمہ وقت ان کے لبوں سے دعا نکلتی رہتی اور پھر جیسے انہونی ہوگئی۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی تھی۔ کرنل حامد نے مدثر کا پروپوزل قبول کرلیا تھا۔

''میں نے مدثر کا پروپوزل اس لیے قبول نہیں کیا کہ مجھے ایمل پر اعتبار نہیں ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ بھی فرحی کی طرح گھر چھوڑ کر چلی نہ جائے...... نہیں بالکل نہیں۔'' انہوں نے انہیں بتایا تھا۔ ''مجھے اس پر اعتبار ہے، یقین ہے کہ میں جہاں اس کی شادی کروں گا وہ سر جھکا دے گی لیکن بس وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ شاید پھر وہ کبھی کھل کر ہنس نہ سکے گی اور میں اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی اپنی پوری زندگی سمجھوتے کی نذر کردے۔'' کرنل حامد نے ایکسٹینشن پر سنی جانے والی ایمل اور مدثر کی گفتگو بھی انہیں بتائی تھی اور پھر ایمل، مدثر کے سنگ رخصت ہوگئی تھی، وہ مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اس کے گالوں پر گلاب چٹکتے تھے اور آنکھوں میں جگنو دمکتے تھے۔ کرنل حامد اور وہ ایمل کو خوش دیکھ کر مطمئن تھے...... مسرور تھے۔ مدثر واقعی ایمل کو ڈیزرو کرتا تھا لیکن پھر کیا ہوا، ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ اور کرنل حامد ایک بار پھر ایمل کی خوشی اور رضا کے لیے مجبور ہوگئے تھے حالانکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایمل اس طرح جلدی میں کوئی فیصلہ کرے...... ان دنوں انہیں پھر فرحی بہت یاد آنے لگی تھی۔ انہوں نے فرحی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا ایمل کو اس کی سزا ملی تھی۔ ان دنوں وہ فرحی کو بہت سوچنے لگی تھیں۔ تب ہی تو وہ انہیں خواب میں دکھائی دی تھی۔ مما، پپا کے درمیان بے حد خوش، خوش کھڑی انہیں شکوہ بھری نظروں سے دیکھتی، گلہ کرتی ہوئی......

''آپ نے میرے لیے میرے گھر کے دروازے بند کردیے تھے۔ آپ دروازہ کھولتیں تو مما اور پپا مجھے معاف کردیتے۔ دیکھیے انہوں نے مجھے معاف کردیا ہے۔''

ایک اذیت دیتا احساسِ جرم دل کو بھینچتا رہتا تھا کیا خبر مما، پپا اور کرنل حامد بھی اس کی بات نہ سنتے لیکن یہ احساس کہ انہوں نے لاشعوری طور پر اسے مما، پپا سے ملنے نہیں دیا تھا۔ انہیں ہر وقت اپ سیٹ رکھتا تھا اور کرنل حامد نے اسے ایمل کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سمجھتے ہوئے فوراً ہی بابر کا پروپوزل قبول کرلیا تھا۔ حالانکہ وہ ایمل کے ساتھ جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس حادثے سے سنبھل جائے تو تب وہ اس کی شادی کے متعلق سوچیں گے لیکن پھر سب کچھ جلدی، جلدی ہوگیا۔ بابر شادی کے فوراً بعد ہی ایمل کے ساتھ کراچی چلا گیا تھا اور کرنل حامد نے اسے کراچی میں کاروبار سیٹ کرنے کے لیے ہر طرح کی مدد کی تھی۔ خود انہوں نے اپنے اکاؤنٹ سے بہت سارا پیسہ نکال کر اس کے حوالے کیا تھا تاکہ اسے نئے کاروبار کو جمانے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اگرچہ ان کی خواہش تھی کہ بابر یہاں لاہور میں ہی رہ کر ان کے ساتھ کام کرے لیکن پھر خود انہوں نے ہی اسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ اپنے طور پر کچھ کر کے خود کو آزمانا چاہتا ہے تو یہ اچھی بات ہے...... بابر اور ایمل ایک خوشگوار اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ممی نے جب بھی ایمل سے پوچھا کہ وہ بابر کے ساتھ خوش ہے تو ایمل نے ہر بار انہیں یقین دلایا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہے اور ان سے شرمندہ ہے کہ اس نے ایک غلط شخص کا انتخاب کر کے ان کا دل دکھایا، انہیں تکلیف پہنچائی۔ وہ مطمئن تھیں لیکن انہیں کبھی اس کے چہرے پر وہ خوشی نظر نہیں آئی تھی جو مدثر کی ہمراہی میں اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ اور کم گو ہوگئی تھی۔ انہوں نے کبھی اسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹیں ماند پڑ گئی تھیں پھر بھی وہ مطمئن تھیں۔ ہاں انہیں اس بات کا ضرور گلہ تھا کہ بابر ان کی بیٹی کو ان سے دور لے گیا ہے۔

''سب کی بیٹیاں شادی کے بعد اپنے والدین سے دور چلی جاتی ہیں۔'' کرنل حامد انہیں تسلی دیتے تھے۔

''لیکن میں نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ بابر کے ساتھ شادی کے بعد ایمل دور چلی جائے گی۔''

''تو اب سوچ لو۔'' کرنل حامد مسکراتے، وہ اپنی بیٹی کی پُرسکون اور مطمئن زندگی سے خوش تھے خاص طور پر ارتقاع کے ساتھ بابر کی محبت نے انہیں بے حد مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اکثر ان سے بابر کی تعریف بھی کرتے تھے لیکن پھر ایکا ایکی ایسا کیا ہوگیا تھا کہ وہ بابر سے متنفر ہوگئے تھے اور اس کا اکثر اظہار کرنے لگے تھے کہ انہوں نے بابر کے ساتھ ایمل کی شادی کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے...... کل شام سے پہلے تک وہ اس کا سبب نہیں جانتی تھیں لیکن کل رات ان کے وارڈ روب سے ان کے کپڑے نکالتے ہوئے ان کے کوٹ کی جیب سے ایک خط نکلا تھا۔ یہ کوٹ ان کے استعمال میں رہتا تھا۔ اور غالباً اس روز بھی انہوں نے یہی کوٹ پہنا ہوا تھا جس صبح انہیں اسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ انہوں نے یہ کپڑے یتیم خانے میں بھجوانے کے لیے نکالے تھے اور پاکٹ وغیرہ چیک کررہی تھیں کہ یہ خط جو اُن کے ہی نام تھا انہیں ملا...... کل رات سے اب تک نہ جانے کتنی بار وہ یہ خط پڑھ چکی تھیں اور ہر بار یہی خط پڑھ کر انہیں دھچکا لگتا تھا...... انہوں نے قریب ہی پڑا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک بار پھر وہ خط نکال کر پڑھنے لگیں۔

''یہ خط تمہیں میری موت کے بعد ملے گا...... میں نہیں جانتا تھا میرے پاس کتنا وقت ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہو چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ دل اب کوئی صدمہ برداشت نہیں کرسکتا۔ ہوسکتا ہے زندگی مجھے اتنی مہلت دے، دے کہ میں یہ سب کچھ تم سے زبانی کہہ سکوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے تم سے کچھ کہنے کی مہلت نہ ملے اس لیے احتیاطاً یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ابھی خود تم سے یہ سب اس لیے نہیں کہنا چاہتا کہ میں خود بہت سی باتوں کی متعلق کنفرم نہیں ہوں اس لیے تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا، ہوسکتا ہے سب غلط ہو لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کچھ غلط نہیں ہے...... بابر کے متعلق مجھے کچھ ایسی اطلاعات ملی تھیں کہ میں خود جا کر اُن کی تصدیق کرنا چاہتا تھا لیکن پھر دل دھوکا دے گیا ہے، یہ اسی روز کی بات ہے جب مجھے پہلا اٹیک ہوا تھا اُس صبح مجھے بابر کی دوسری شادی کا پتا چلا تھا۔ وہ جو یہاں بزنس کے بہانے آتا تھا دراصل اپنی بیوی کے پاس...... یہ اطلاع صحیح تھی یا غلط میں ابھی تک اس کی تصدیق نہیں کرسکا ہوں...... میں ایما کی شادی بابر کے ساتھ کبھی بھی کرنے کا کبھی خواہاں نہیں تھا شاید ناصر نوید کی وجہ سے لیکن پھر تمہاری خواہش تھی اور بعد میں بابر کے رویّے نے مجھے بھی مطمئن کردیا...... بابر کے متعلق مجھے کس نے بتایا اور کیسے......؟ اس کی تفصیل زندہ رہا تو پھر سہی مختصراً ناصر نے نشے میں کہیں بک دیا تھا کہ بابر نے ایمل سے شادی صرف اس کی دولت حاصل کرنے کے لیے کی ہے اور یہ کہ اس کی ایک اور بیوی بھی ہے۔ ایک مخلص نے ہی مجھے بتایا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہی کہ اگر یہ سب کنفرم ہوگیا تو میں کیا کروں گا...... ایمل کو کیا بتاؤں گا اب جبکہ اس کے بچے جوان ہوگئے ہیں...... وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے میں میرا رویّہ اور ردِّعمل کیا ہونا چاہیے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔ اس کشمکش نے مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا ہے۔ سینے کے اندر ایک ہلچل مچی ہے، میں نے کچھ اقدامات کیے ہیں جن کے متعلق ہمدانی صاحب اور وکیل صاحب سے تمہیں پتا چل جائے گا...... میں جانتا ہوں یہ انکشاف تمہارے لیے بھی تکلیف دہ ہوگا...... ایسے میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا لیکن موت پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ ایک اور خیال بار، بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ مدثر کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ وہ سچا تھا اور یہ سازش بابر نے کی تھی ایمل سے شادی کرنے کے لیے۔ خدا کرے کہ میرا یہ خیال غلط ہو۔

تمہارے ذمے ایک اور کام بھی سونپ رہا ہوں۔ بہت دنوں سے یہ خیال میرے دل میں تھا کہ میں فرحی کو تلاش کرکے اس کا شرعی حق اسے دے دوں...... لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے تلاش کرتا بابر کی شادی کی اطلاع نے مجھے ڈھا دیا۔ پاپا کی جائداد میں فرحی کا جتنا بھی حصہ بنتا تھا میں نے اس کے پیپرز فرحی کے نام سے تیار کروا دیے ہیں۔ تم نے اسے تلاش کرنا ہے۔ وہ اگر اس دنیا میں نہیں بھی رہی تو اس کی اولاد میں سے تو ضرور کوئی ہوگا۔ تمہیں یہ

کام ضرور کرنا ہے۔ کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ میرے پاس بیٹھی تھی، بالکل اپنے بچپن کی طرح اپنا ایک ہاتھ میرے بازو پر رکھے ہولے، ہولے کچھ کہتی ہوئی...... میرا دل کہتا ہے میری رفیق کہ میں نہیں بچوں گا۔ تمہیں سب کچھ سنبھالنا ہے اور سارے معاملات کو ہینڈل کرنا ہے، یہ خط میں ہمدانی صاحب کو دے جاؤں گا تم ہر معاملے میں ان پر ٹرسٹ کر سکتی ہو۔ اور آخر میں مجھ سے تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کبھی کوئی غفلت ہوئی ہو یا کبھی میں نے تم سے کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔''

انہوں نے خط پڑھ کر پھر بیگ میں رکھ دیا تھا۔

''کیسے...... میں کیسے ہینڈل کروں گی سب اگر بابر کے متعلق ہر بات سچ نکلی تو......؟ ایمل سے کیا کہوں گی اور پھر فرحی کو کہاں ڈھونڈوں گی؟'' وہ سوچتے، سوچتے تھک گئی تھیں۔ اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

بابر بالکل غیر متوقع طور پر آیا تھا لیکن انہوں نے بابر کو کچھ نہیں جتایا تھا۔ خط کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی تاہم وہ ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے نہیں ملی تھیں...... بابر کا لہجہ اور اس کا مطالبہ ظاہر کر رہے تھے کہ کرنل حامد کو جو اطلاعات ملی تھیں ان میں کہیں نہ کہیں کوئی سچ ضرور تھا لیکن وہ بابر سے کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہمدانی صاحب سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ یقیناً انہیں بہت ساری ایسی باتوں کا بھی علم ہوگا جن کا ذکر کرنل حامد نے اپنے خط میں نہیں کیا تھا۔ کرنل حامد کو ہمدانی صاحب پر بہت بھروسا تھا اور انہیں ان سے ہی مشورہ کرنا تھا اور وہ ان سے ملنے کے ارادے سے ہی تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تھیں کہ بابر آ گیا تھا۔ بابر کے رونے سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھیں انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی نم آنکھیں پونچھیں اور ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں...... انہیں ہمدانی صاحب کی طرف جانا تھا، وہ ملازمہ کو اپنے جانے کا بتا کر لاؤنج سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

رواحہ آنکھیں موندے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ انہوں نے فریج سے جوس کا ڈبا نکالا، گلاس میں جوس ڈالا اور گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا...... رواحہ نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

''رواحہ میری جان جوس پی لو۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ نے مجھے سیب کھلایا تھا۔'' وہ مسکرایا۔

''تو اتنا خون بھی تو ضائع ہوا ہے ناں میرے بچے کا۔'' انہوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس کے پیچھے تکیے درست کر کے رکھے اور جوس کا گلاس اٹھا کر اسے دیا تب ہی عظام نے اندر قدم رکھا۔

''بڑی خاطریں کروا رہے ہو بابا سے۔''

''ہاں تو میرے بابا ہیں ناں۔''

اس نے بہت فخر، محبت اور مان سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے اور عظام کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز دیکھ کر ناراضی سے بولے۔

''یار یہ تم پھر اتنا کچھ اٹھا لائے ابھی تو فریج بھرا پڑا ہے۔''

''تو کیا ہوا بابا۔'' اس نے مڑ کر اپنے پیچھے آتے خدابخش کی طرف دیکھا اور شاپرز اسے پکڑائے۔

''چاچا انہیں فریج میں رکھ دیں اگر بہت زیادہ سامان ہے تو وارڈ میں مریضوں کو تقسیم کر دیں۔''

خدابخش نے اس کے ہاتھ سے شاپرز پکڑ لیے۔

''تو اور کیا، جاتے ہوئے سب بانٹ جائیں گے۔ مریض دعائیں دیں گے صاحب، ابھی تو رکھ رہا ہوں۔ کیا خبر کب تک اِدھر رہنا ہے۔''

''زیادہ نہیں چاچا...... ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آئے تھے انہوں نے کہا ہے کہ کل تک ڈسچارج کردیں گے۔''

''اللہ کا شکر ہے صاحب آپ کے بغیر تو گھر ویران، بیاباں لگتا ہے۔'' خدا بخش سامان فریج میں رکھ کر مڑا اور محبت پاش نظروں سے رواحہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''سچ کہتا ہوں گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے...... میں تو کل سارا دن گیٹ پر ہی بیٹھا رہا اندر دل گھبراتا تھا۔''

''دل گھبراتا تھا یا ڈر لگتا تھا؟'' عظام نے شرارت سے اسے دیکھا اور رواحہ کے بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ڈر کس بات کا بیٹا......؟ بس خالی گھر میں دل گھبراتا تھا۔''

خدا بخش سادگی سے کہتا ہوا دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کی طرف دیکھا۔

''اللہ جانے کون ہمارے بچے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ پہلے گھر پر دھاوا بول دیا اور اب...... میں تو کہتا ہوں صاحب واپس لاہور چلیں...... بہت رہ لیا یہاں۔''

''ٹھیک کہتے ہو خدا بخش، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' عظام اور رواحہ دونوں نے ایک ساتھ چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم صوفے پر بیٹھے تھے۔

''کیا واقعی بابا آپ لاہور جانے کا سوچ رہے ہیں؟'' رواحہ نے حیرت سے پوچھا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

''موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے بابا...... پھر ہم ڈر کر اپنا گھر اپنا شہر کیوں چھوڑ دیں...... اور ظفری سے تو میں خود بات کرلوں گا بابا۔''

''ارے ہاں ظفری آیا تھا یہاں تمہاری عیادت کو۔'' عظام کو یک دم یاد آیا۔

''کون ظفری......؟'' رواحہ چونکا۔

''کب آیا تھا؟''

''جب تم آئی سی یو میں تھے، بکے لے کر آیا تھا۔''

''لیکن کیوں......؟'' اسے حیرت ہوئی۔ ''اسے بھلا کیا ضرورت تھی آنے کی وہ تو خود ہی......''

''شاید وہ تمہاری کنڈیشن معلوم کرنا چاہتا ہو یا پھر شو کرنا چاہتا ہو کہ وہ اس سارے معاملے سے بے خبر ہے۔'' عظام کو بابا کی موجودگی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔

''ربش......'' رواحہ کے ماتھے پر شکنیں سی پڑیں۔

''کون ظفری...... وہی ناں جو کسی ایم این اے کا بیٹا ہے اور خواہ مخواہ ہی رواحہ کا دشمن بن گیا ہے۔'' انہوں نے متوحش نظروں سے عظام کی طرف دیکھا تو عظام دل ہی دل میں نادم ہوا اسے بابا کے سامنے ظفری کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں عظام...... میں اس سے پوچھتا تو کہ میرے بچے نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اتنے سارے لڑکے آئے تھے۔ ان میں ظفری کون سا تھا۔''

''بابا پلیز ریلیکس......'' عظام بیڈ سے اٹھ کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

''کیسے پریشان نہ ہوں عظمی بیٹا! کیا وہ پھر کبھی رواحہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اتنے سارے یونیورسٹی فیلوز سے تم نے ملوایا مجھے...... ان میں سے آخر کون تھا وہ تم نے مجھے کیوں نہیں ملوایا؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو عظام نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بتایا۔

”آپ ملے تو تھے اس سے بابا..... وہ ظفر سومرو تھا۔ سب اسے ظفری کہتے ہیں۔“
”تمہارا مطلب ہے ظفر سومرو ہی وہ ظفری ہے جو...“ ان کے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ بے اختیار تھی۔ وہ اس روز سمجھ نہیں پائے تھے کہ ظفری نے جاتے ہوئے کس بات پر سوری کیا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتنی شرمندگی کیوں تھی لیکن اب انہیں جو ادراک ہو رہا تھا اس نے اُن کے پورے وجود میں سکون و اطمینان کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ یکا یک وہ بے حد مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ بے سکون اور بے چین تھے کبھی سوچتے یہاں سے گھر بار فروخت کر کے لاہور چلے جائیں۔ کبھی سوچتے پولیس میں رپورٹ درج کروائیں کہ ان کے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے کبھی خود جا کر ظفری سے بات کرنے کا پروگرام بناتے کبھی خیال آتا رواحہ کو سمجھائیں کہ وہ ارتقاع کا خیال چھوڑ دے۔ دنیا بھری پڑی ہے اچھی لڑکیوں سے ضروری نہیں کہ صرف ارتقاع ہی...... پھر خود ہی ہر خیال کو رد کرتے چلے جاتے۔ انہیں لگتا کہ ان کے پاس صرف ایک ہی آپشن ہے کہ وہ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں کسی چھوٹے سے شہر یا قصبے میں۔
”بابا آپ پریشان نہ ہوں۔“ عظام نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”پاپا آئیں گے، شام کو تو پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“
”نہیں، میں بالکل بھی پریشان نہیں ہوں۔“ وہ کھل کر مسکرائے تھے۔ ”اور تم لوگوں کو بھی پریشان ہونے اور ظفری سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب رواحہ کو پریشان نہیں کرے گا۔ کبھی اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔“ انہوں نے بے حد یقین سے کہا۔ جبکہ رواحہ اور عظام نے انہیں بے حد حیرت سے دیکھ رہے تھے۔
”آپ اتنے یقین سے ایسا کیسے کہہ رہے ہیں بابا؟“ رواحہ نے خالی گلاس جسے وہ بہت دیر سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا ذرا سا جھک کر بیڈ کے ساتھ پڑی چھوٹی ٹیبل پر رکھا اور اس کے لبوں سے کراہ نکلی...... عظام اور وہ ایک ساتھ اٹھے تھے۔
”کیا کرتے ہو بیٹا...... ابھی تمہارے زخم کچے ہیں۔“ وہ ہولے، ہولے اس کا بازو سہلانے لگے۔
”میں ٹھیک ہوں بابا لیکن آپ کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ آپ ظفری کو نہیں جانتے، وہ بہت شیطان صفت ہے۔“
”تھوڑا بہت تو میں اسے جانتا ہی ہوں میری جان، وہ میرا اسٹوڈنٹ رہا ہے کچھ عرصہ۔“
”تو کیا آپ اس کے پاس جا کر منت کریں گے چونکہ آپ اس کے ٹیچر رہے ہیں لہٰذا وہ آپ کے بیٹے کو کچھ نہ کہے۔ نہیں بابا پلیز مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ میں خود دیکھ لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“
”نہیں میری جان، مجھے اس کے پاس جانے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے جان لیا ہے کہ تم میرے بیٹے ہو تو یہ بہت کافی ہے۔“ ان کے لہجے میں بلا کی طمانیت تھی...... رواحہ نے کندھے اچکائے اسے ان کے یقین پر اب بھی حیرت تھی۔ تب عظام ہولے، ہولے اسے بتانے لگا کہ کیسے بابا نے ایک بار اس کی زندگی بچائی تھی۔ بات مکمل کر کے وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔
”تو یہ بات ہے بابا لیکن......“ رواحہ اب بھی متذبذب تھا۔
”ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر اس کا بازو تھپتھپایا۔
”اس نے جاتے ہوئے مجھے سوری کہا تھا۔ وہ فطرتاً اچھا لڑکا ہے لیکن اس کے ماحول نے اسے کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے۔“
وہ ایسے ہی تھے بالکل ماں، باپ کی طرح جو اولاد کی غلطیوں کے باوجود انہیں سینے سے لگاتے ہیں اور ہمیشہ

ان سے اچھی توقع رکھتے ہیں۔ انہیں بھی ہمیشہ اپنے شاگردوں سے اچھی توقع رہتی ہے وہ ہمیشہ پُرامید رہتے تھے۔

رواحہ اور عظام نے ان کی بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ دل مطمئن ہوا تو تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ رتجگوں سے بوجھل آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

''روی بیٹا میں کچھ دیر کے لیے گھر جا رہا ہوں فریش ہو کر آتا ہوں۔ عظام اور خدا بخش ہیں ناں یہاں۔''

''بالکل یہی بات میں آپ سے کہنے والا تھا بابا۔'' عظام مسکرایا۔

''آپ گھر جا کر آرام کریں۔ باتھ لے کر سو جایئے گا۔ رات کو بھی مت آیئے گا۔ میں رات کو اِدھر ہی رہوں گا۔ جواد بھی آ جائے گا۔ خدا بخش چاچا کو بھی ساتھ لے جائیں، ان کی ضرورت نہیں ہے یہاں۔''

انہوں نے سر ہلایا اور جھک کر رواحہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''او کے میری جان۔''

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

''آ جائیں......''

دروازہ کھول کر اندر آتی ارتقاع کو دیکھ کر اُن کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آؤ، آؤ بیٹا آ جاؤ......''

''السلام علیکم......'' ارتقاع نے مشترکہ طور پر سب کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑے پھول رواحہ کے سرہانے رکھے۔

''کیسے ہو؟''

''بہت بہتر......!'' رواحہ کی آنکھیں یک دم جگمگا اٹھی تھیں۔

''اور تھینک یو رتی!'' اس نے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر اس کی نظروں نے ارتقاع کے چہرے کا طواف کیا۔ ارتقاع کے رخساروں پر سرخی سی جھلکی۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے خدا بخش کی خالی کی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پھر پہلے رواحہ کو اور پھر اسے دلچسپی سے دیکھا، وہ آج اسے تیسری بار دیکھ رہے تھے۔

رواحہ کے حادثے والے دن روتی ہوئی، زیرِلب دعائیں مانگتی، انہوں نے چند بار اسے سرسری سا دیکھا تھا۔ اور اس کے لیے اپنائیت بھی محسوس کی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے اور لبوں پر جو دعائیں تھیں وہ ان کے رواحہ کے لیے تھیں......لیکن وہ خود اتنے پریشان تھے کہ انہوں نے اس وقت اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

دوسری بار وہ کل اپنی کچھ کلاس فیلو لڑکیوں کے ساتھ آئی تھی اور وہ انہیں رواحہ کے کمرے میں چھوڑ کر خود ثمر حیات کے ساتھ وزیٹرز روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ثمر حیات نے انہیں کھل کر مٹھا سائیں کے متعلق بتایا تھا کہ وہ کتنے... بارسوخ لوگ ہیں اور انہوں نے کیوں رواحہ کو ان کا نام لینے سے منع کیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ظفیری کی اس حرکت کو فراموش کر دیں گے، وہ ضرور کچھ ایسا کریں گے کہ آئندہ ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ ثمر حیات نے انہیں تسلی دی تھی لیکن وہ پھر بھی بہت بے چین تھے اور انہوں نے رواحہ کی کلاس فیلوز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی اور جب جاتے ہوئے ارتقاع نے انہیں خدا حافظ کہا تھا تب بھی انہوں نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی لیکن اس وقت وہ بہت اطمینان اور سکون سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں وہ بہت اپنی، اپنی سی لگی تھی اور انہوں نے دل ہی دل میں رواحہ کی پسند کو سراہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے یکا یک ان کی نظریں اس کی بائیں ابرو کے اوپر چھوٹے سے سیاہ تل پر پڑی تھیں۔ اور غیر ارادی طور پر ان کا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا اور انہوں نے شہادت کی انگلی سے اپنے بائیں ابرو کے

اوپر پیشانی پر موجود تل کو چھوا اور اس...... اس کی پیشانی پر بھی تو یونہی بائیں ابرو کے اوپر ایسا ہی سیاہ تل تھا، ان کا دل ان کے سینے کے اندر تیزی سے دھڑکا یوں جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آ جائے گا...... تل کو سہلاتا ان کا ہاتھ بے اختیار نیچے گرا اور دل پر ٹھہر گیا۔

''اور کیا وہ...... پتا نہیں وہ کہاں ہوگی، کیسی ہوگی...... اور پتا نہیں وہ میرے متعلق جانتی ہوگی یا نہیں...... اور پتا نہیں اس کا نام کیا ہوگا؟'' انہوں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ جتنی بار بھی وہ اس سے ملنے گئے اسے گود میں لیتے ہی سب کچھ بھول جاتے تھے۔ بس اسے دیکھتے تھے، چومتے تھے...... اور بے خود سے ہو جاتے تھے...... اور وہ ان کی گڑیا تھی۔ چاندنی تھی، روشنی تھی۔ دل ہی دل میں انہوں نے اسے کتنے نام دے رکھے تھے۔ لیکن چندا اسے کس نام سے پکارتی تھی۔ اس نے اس کا کیا نام رکھا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ بچوں کی پیدائش سے پہلے چندا نے کتنے ہی نام سوچ رکھے تھے۔ لڑکے ہوئے تو یہ نام رکھیں گے لڑکیاں ہوئیں تو یہ نام......

انہوں نے دل ہی دل میں ان سارے ناموں کو یاد کرنے کی کوشش کی جو اکثر چندا ان کے سامنے دہراتی رہتی تھی لیکن ان یاد آنے والے ناموں میں ارتقاع نام تو کہیں نہیں تھا...... اور پھر یہ لڑکی جس کے بائیں ابرو کے اوپر پیشانی پر ننھا سا سیاہ تل تھا اور جس نے ان کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ پتا نہیں کون تھی...... یہ وہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو...... جب وہ رواحہ کو لے کر کراچی آ رہے تھے تو آخری بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے حامد ولا میں فون کیا تھا۔ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتے تھے...... وہ صرف اس کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کیسی ہے اور وہ صرف ممی سے یا کرنل حامد سے بات کرنا چاہتے تھے، کسی اور سے بات کرنے کے تصور سے ہی وہ خوفزدہ ہو جاتے تھے اور ممی نے نہ صرف ان کی بات سنی تھی بلکہ ان سے بات بھی کی تھی۔

''ہم نے اس کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر چلی گئی ہے۔ اور اس کا شوہر اس کی بیٹی کو بے تحاشا چاہتا ہے۔ بالکل اپنی بیٹی کی طرح اس سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے تم مطمئن رہو...... جہاں تک اپنی بچی سے ملنے کی بات ہے تو چندا نے وہاں ہی سیٹلڈ ہونے کا فیصلہ کیا ہے اگر کبھی وہ ہم سے ملنے پاکستان آئی بھی تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ تم اس سے مت ملنا، وہ بابی کو ہی اپنا باپ سمجھتی ہے، وہ ڈسٹرب ہو جائے گی۔ تم باپ ہو اس کے یقیناً اس کی بہتری ہی چاہو گے۔'' ممی نے دھمکی نہیں دی تھی۔ خوفزدہ نہیں کیا تھا لیکن مشورہ انہوں نے بھی یہی دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی بھلائی کے لیے اس سے دور ہی رہے۔ ایک گہری سانس لے کر انہوں نے پھر ارتقاع کی طرف دیکھا تھا جو ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھی اور گاہے گاہے نگاہ اٹھا کر رواحہ کی طرف دیکھتی تھی۔ اور جب وہ رواحہ کی طرف دیکھتی تو اس کا چہرہ چمک اٹھتا تھا اور اس لڑکی کے ماتھے پر بائیں ابرو کے اوپر چھوٹا سا سیاہ تل بار، بار انہیں ماضی کی طرف دھکیلتا تھا۔

''بیٹا آپ شروع سے ہی پاکستان میں ہیں یا کچھ عرصہ ملک سے باہر بھی رہی ہیں؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''نہیں، انکل میں کبھی ملک سے باہر نہیں گئی۔ ہم لوگ یہاں کراچی میں ہی رہتے ہیں بلکہ میری پیدائش سے پہلے بھی پاپا یہاں ہی رہتے تھے۔ اپنے بزنس کے سلسلے میں، میرے دادا، دادی گوجرانوالہ میں رہتے ہیں اب بھی۔''

ارتقاع نے بتایا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

''تو یہ...... وہ نہیں ہو سکتی۔'' دل کے اندر مایوسی نے پر پھیلائے تاہم اس سے انہوں نے اپنے دل میں اس

کے لیے بے حد محبت محسوس کی...... یہ جو کوئی بھی تھی ان کے رواحہ کی پسند تھی۔

''بیٹا آپ مجھے انکل کے بجائے بابا کہو گی تو مجھے خوشی ہو گی۔ یہ رواحہ کے دوست عظام اور جواد وغیرہ سب ہی مجھے بابا کہتے ہیں اور آپ تو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''جی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''مجھے بھی آپ کو بابا کہنا اچھا لگے گا۔''

''ریئلی......!'' انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

لانبی پلکیں، صاف رنگت، دلکش نقوش انہوں نے بے حد دلچسپی اور اپنائیت سے اسے دیکھا۔ ان کا جی چاہا وہ کچھ دیر اور رک جائیں، باتیں کریں، اس سے اس کے خاندان، والدین سب کے متعلق پوچھیں۔ آخر انہیں رواحہ کے لیے اس کے گھر جانا تو ہوگا تو انہیں پہلے سے کچھ تو علم ہو اس کی فیملی کے متعلق......

''کس کے ساتھ آئی ہو؟'' عظام کو اچانک خیال آیا تھا۔

''اپنے ساتھ......'' وہ ہولے سے ہنسی۔ ''یعنی میری گاڑی ورکشاپ سے آ گئی ہے۔''

''لیکن تمہارے پاپا تو تمہیں نئی گاڑی لے کر دے رہے تھے۔'' عظام کو یاد آیا تھا۔

''ہاں لے کر تو دے رہے تھے لیکن ماما نے منع کر دیا۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

''اوہ ویری سیڈ......'' عظام نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''افسوس کی ضرورت نہیں ہے، پاپا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اگلے مہینے مجھے میری پسند کی گاڑی لے دیں گے۔''

''یعنی تم پاپا کی جیب خالی کرنے کا پکا ارادہ کیے ہوئے ہو۔'' عظام کی آنکھوں میں اب بھی شرارت تھی۔

''پاپا کو فرق نہیں پڑتا پچیس تیس لاکھ سے یہ تو ماما نے خواہ مخواہ ہی منع کر دیا انہیں لیکن پاپا پروا نہیں کرتے ان کی باتوں کی۔''

انہیں لگا جیسے اچانک کوئی بھاری وزنی چیز ان کے دل پر آ کر لگی ہو۔ ان کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ ایک مانوس سی دکھن سارے وجود میں پھیلتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ تو کیا رواحہ نارسا رہے گا۔ یہ اتنے امیر آدمی کی بیٹی ہے، شاید کوئی بڑا بزنس مین جس کے لیے پچیس تیس لاکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور رواحہ ایک ڈیڑھ لاکھ ماہوار تنخواہ پانے والے پروفیسر کا بیٹا...... رواحہ جس کی بچپن سے لے کر اب تک ہر خواہش پوری کی تھی۔ تو کیا اب یہاں آ کر نارسائی اس کا مقدر بننے والی ہے۔

خدا بخش نے انہیں جوس کا گلاس پکڑایا تو وہ دل پر بھاری بوجھ لیے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ضروری تو نہیں رواحہ کے ساتھ ایسا ہو۔ پچیس سالوں میں بہت سی اقدار اور روایات بدل گئی تھیں۔ لوگ بچوں کی پسند کو اہمیت دینے لگے تھے۔ ایسے، ایسے گھرانے جہاں خاندان سے باہر شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ خاندان اور برادری سے باہر رشتے کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ارتفاع کے والدین بھی ارتفاع کی پسند کو اولیت دیتے ہوئے رواحہ پر کوئی اعتراض نہیں کریں۔ انہوں نے خود کو تسلی دی اور گھونٹ، گھونٹ جوس پینے لگے۔ خدا بخش اب پھل کاٹ رہا تھا اور وہ منع کر رہی تھی اُن کی نظریں بھٹک، بھٹک کر اس کی بائیں ابرو کے اوپر پیشانی پر موجود تل پر پڑتیں تو وہ کھو سے جاتے اور پھر اس کی طرف دیکھتے، دیکھتے وہ بہت پیچھے ماضی میں چلے گئے تھے۔ جب دن بے چینی سے اور راتیں تڑپتے گزرتی تھیں۔ وہ انہیں بے حد یاد آتی تھی۔ وہ سرخ و سپید قلقاریاں مارتی بار، بار ان کے تصور میں آتی تو وہ...... بے چین ہو جاتے۔ پتا نہیں کیسے انہوں نے خود کو روک رکھا تھا لیکن کبھی، کبھی لگا میں ہاتھوں سے چھوٹ جاتیں تو وہ حامد ولا پہنچ جاتے اور گھنٹوں باہر منڈلاتے رہتے کہ شاید کہیں وہ کسی ملازمہ کی گود میں نظر میں آ جائے۔ کبھی پارک میں جا کر بیٹھ جاتے۔ کیا خبر کوئی ملازمہ اسے پارک میں لائے تو وہ بس ایک نظر اسے دیکھ لیں لیکن پھر گھبرا کر واپس

آ جاتے اگر چندا کے کزن نے انہیں وہاں دیکھ لیا تو کہیں وہ ان کی بچی کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اور ان کی اس ذہنی کیفیت سے بے خبر اُن کے بابا جان ان دنوں بے حد خوش تھے۔ وہ اکثر خدا بخش کے ساتھ اس کی شادی کی باتیں کرتے رہتے تھے اور وہ اپنی بے چینیاں بابا جان سے چھپاتے، کتنے عرصے بعد وہ ذرا سے پُرسکون ہوئے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ فوراً جا کر مونا کی والدہ سے ثنا کے لیے بات کریں۔ لیکن مونا کی والدہ مونا کے بیٹے کی پیدائش کی وجہ سے مونا کے پاس ملتان گئی ہوئی تھیں اور بابا جان ہر دوسرے تیسرے دن حنا یا ثنا سے ان کی واپسی کے متعلق پوچھتے تھے۔ اس شام وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے بظاہر ٹی وی دیکھ رہے تھے لیکن ان کا سارا دھیان اپنی بیٹی کی طرف تھا کہ وہ اب تو تھوڑی اور بڑی ہوگئی ہوگی...... اب تو شاید بات بھی کرتی ہو...... ماما، پاپا بلاتی ہوئی، لڑکھڑا کر چلتی ہو اور گرنے سے پہلے ہی چندا اسے تھام لیتی ہو...... وہ اپنے آپ میں اتنے گم تھے کہ انہیں بالکل بھی خبر نہیں تھی کہ پاس بیٹھے بابا جان اور خدا بخش کیا بات کر رہے ہیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے بیٹا؟''

بابا جان نے ایک دم انہیں مخاطب کیا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''کیسا خیال بابا جان!''

''میں خدا بخش سے کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ گاؤں سے تمہاری پھپھو کو بلوالیں میں نے اُدھر فون کیا تھا ثنا بتا رہی تھی کہ ایک دو روز میں اس کی امی آ جائیں گی تو میں نے سوچا تمہاری پھپھو ہوں گی تو مونا کی والدہ سے ذرا سلیقے، قرینے سے بات کرلیں گی۔''

''جی بابا جان جو آپ مناسب سمجھیں، میں جا کر پھپھو کو لے آتا ہوں۔'' انہوں نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

''تم راضی تو ہو ناں بیٹا...... دل سے راضی ہو، ایسا نہ ہو کہ مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ بچی جو تمہارے حوالے سے اس گھر میں آئے گی اس کے بھی بہت سے خواب ہوں گے۔'' بابا جان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔

''بابا جان!'' انہوں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور اس کی کسی قسم کی کوئی حق تلفی ہو اور آپ کو شرمندہ ہونا پڑے لیکن بابا جان مجھے تھوڑا وقت اور دے دیں۔ بے شک بات ابھی کرلیں لیکن رخصتی کے لیے کچھ وقت زیادہ نہیں تھوڑا بس چند ماہ......''

''ارے میری جان، وہ کون سا رخصتی کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے۔ ابھی تو سال پہلے ایک بیٹی کو رخصت کیا ہے یوں تو میں نے سوچ رکھا ہے انہیں کہہ دوں گا ہمیں کچھ نہیں چاہیے سوائے ثنا بیٹی کے لیکن لڑکی والے ہیں کچھ تو وقت چاہیے ہوگا انہیں بھی۔ پھر مونا کے والد ملک سے باہر ہیں۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اقرار کرتے ہیں یا انکار، ہوسکتا ہے انہوں نے کہیں بات طے کر رکھی ہو۔ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں زیادہ رابطہ بھی تو نہیں ہے۔'' بابا جان نے لمبی بات کی تھی۔

''تو بابا جان پلیز آپ رہنے دیں ناں......'' انہوں نے بے حد زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''مونا چندا کی دوست تھی اور چندا نے وہ ساری باتیں مونا کو بھی تو بتائی ہوں گی اور پتا نہیں وہ میرے متعلق کیا سوچتے ہوں گے کہ میں ایسا ہوں...... بدکردار...... عیاش۔''

''نہیں......'' بابا جان بے حد طمانیت سے مسکرائے تھے۔ ''بے شک مونا سے چندا نے یہ سب کہا ہوگا لیکن وہ کانوں کی کچی نہیں ہے۔ تمہاری علیحدگی کے بعد دو تین بار ان سے بات ہوئی۔ گھر پر بھی آئیں۔ انہیں چندا کی عقل پر افسوس تھا اور انہوں نے کسی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔''

اور وہ خاموش ہو گئے تھے۔ ان کا دل اب کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ انہیں رفاقتوں، محبتوں اور وفاؤں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن بابا جان کی خاطر...... صرف ان کے دل کے اطمینان کے لیے وہ یہ زہر پینے کو تیار ہوئے تھے۔

''ربا مجھے ہمت اور حوصلہ دینا کہ میں ایمانداری کے ساتھ اس تعلق کو نبھا سکوں جو بابا جان جوڑنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔ تب ہی بابا جان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''جانِ پدر چلو آج اپنی بیٹی سے ملنے چلتے ہیں۔''

''نہیں......'' ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ان کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔

''نہیں......'' انہوں نے جھرجھری سی لی تھی، آنکھوں کے سامنے اپنی گڑیا کی خون میں لت پت لاش آ گئی تھی۔

بابا جان پریشان سا ہو کر انہیں دیکھنے لگے تھے اور ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت شفقت اور محبت سے پوچھا بھی تھا۔

''کیا بات ہے جانم، کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے...... کیا اپنے بابا جان سے شیئر نہیں کرو گے۔''

''کچھ نہیں بابا جان...... کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے نظریں چرائی تھیں۔

''تو پھر تم اپنی ہی بیٹی سے ملنے سے کیوں کترانے لگے ہو۔ جب بھی ملنے کی بات کرتا ہوں ٹال دیتے ہو۔'' بابا جان نے وہ بات پوچھ لی تھی جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔

''ایسے ہی بابا جان شاید وہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ میں اس سے ملنے جاؤں۔'' انہوں نے بابا جان کی طرف نہیں دیکھا۔

''پسند نہیں کرتے تو نہ کریں پسند۔'' غیر ارادی طور پر بابا جان کی آواز بلند ہوئی تھی۔ وہ ہماری بچی ہے، ہمارا خون ہے، ہمارا حق ہے کہ ہم اس سے ملیں۔ میری خود کرنل صاحب سے بات ہوئی تھی انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ہم ہفتہ دس دن بعد اپنی بچی سے ملنے جائیں بلکہ میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ ذرا بڑی ہو جائے تو ہم اسے گھر لایا کریں گے۔ اس کا جی چاہا تو وہ یہاں رک بھی جایا کرے گی۔ چلو بیٹا اٹھو ابھی چلتے ہیں۔ میں نے تو اسے بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔ تم ان کی پسند ناپسند کا سوچ کر خود پر جبر مت کرو...... چلتے ہیں بلکہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ پڑھ کر نکلتے ہیں۔''

''بابا جان......!'' وہ ضبط کرتے، کرتے تھک چکے تھے۔ اُن کی آنکھیں خون رنگ ہوئیں اور پھر چھلک پڑیں۔

''بابا جان......'' وہ بے دردی سے لب کچل رہے تھے۔

''میری جان۔'' بابا جان نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ان کے کندھے پر سر رکھے، رکھے وہ رو پڑے تھے۔ اور پھر وہ سب کچھ انہوں نے بابا جان سے کہہ دیا تھا جو چندا کے کزن نے ان سے کہا تھا۔

بابا جان ساری بات سن کر لمحہ بھر کے لیے تو ساکت رہ گئے تھے اور پھر اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے تھے۔

''اتنے دنوں سے دل پر یہ بوجھ لیے پھر رہے ہو اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ میں کرنل صاحب سے خود جا کر بات کرتا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کس طرح کر سکتا ہے وہ ہماری بچی کے ساتھ ایسا اور کیوں؟''

''اور کرنل صاحب آپ کی بات کا یقین کر لیتے بابا جان...... ہرگز نہیں...... کبھی نہیں...... وہ سمجھتے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور وہ شخص میری بیٹی کو غصے اور ضد میں آکر مار دیتا پھر......؟ نہیں بابا جان مجھے اپنی بیٹی کی زندگی چاہیے۔ وہ جیتی رہے، زندہ رہے، ہم ملیں یا نہ ملیں۔'' ان کے اعصاب کمزور پڑ چکے تھے۔ وہ ہولے، ہولے لرزنے لگے تو بابا جان نے انہیں اپنے ساتھ لگا کر کھینچ لیا اور انہیں ہولے، ہولے تھپکتے رہے تھے دلاسا دیتے رہے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ کسی دوست سے مشورہ کریں گے وکیل سے بات کریں گے۔ کرنل صاحب سے بہت سوچ سمجھ کر بات کریں گے۔

''لیکن بابا جان اگر وقتی طور پر سب ٹھیک بھی ہو جائے تو اسے رہنا تو چندا کے پاس ہی ہے ناں...... اور وہ شخص بعد میں بھی...... نہیں بابا جان پلیز آپ کچھ نہیں کریں گے۔ ہم جی لیں گے۔ ہم اس کے بغیر بھی جی لیں گے۔ بس وہ جیتی رہے، زندہ رہے، خوش رہے۔''

''وہ انشاء اللہ جیتی رہے گی۔''

بابا جان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ مغرب کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ خدا بخش نے دوبار آکر کھانے کے لیے پوچھا تھا لیکن دونوں نے ہی منع کر دیا تھا...... کتنی ہی دیر وہ لاؤنج میں بیٹھے رہے تھے...... گاہے، گاہے بابا جان سر اٹھا کر سوچتی نظروں سے انہیں دیکھتے۔ آہستگی سے ان کا بازو تھپتھپا کر خاموشی کی زبان میں تسلی دیتے اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتے۔

''بابا جان آپ جا کر آرام کریں اور پریشان مت ہوں...... میں ٹھیک ہوں، آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے...... تو یہ زخم بھی ایک دن بھر جائے گا اور پھر جب آپ کی بہو آجائے گی، بچے ہوں گے تو......'' وہ شعوری کوشش سے مسکرایا تھا۔

''ہاں......'' وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے...... لیکن وہ اس کی بات پر مسکرائے نہیں تھے۔

''تم بھی آرام کرو...... اور دودھ پی لینا کھانا بھی نہیں کھایا تم نے۔''

''جی بابا جان......'' انہوں نے ساتھ ہی خدا بخش کو آواز دی تھی۔

''خدا بخش بابا جان کے لیے بھی دودھ گرم کر کے لے جانا۔'' اور بابا جان نے جاتے، جاتے مڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی پیشانی پر تفکر سے لکیریں سی پڑی تھیں اور آنکھوں سے کرب جھانکتا تھا۔ ایسا کرب جو دل کو ریزہ، ریزہ کرتا تھا...... بے اختیار ان کا جی چاہا تھا وہ انہیں روک لیں، ان سے کہیں بابا جان پلیز ابھی اپنے بیڈروم میں مت جائیں یہاں ہی بیٹھیں میرے پاس۔ آپ پاس ہوں تو دل کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بابا جان اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے اور ان کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ بابا جان کے کندھے جھکے ہوئے تھے ان کی چال میں تھکن تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ وہاں ہی بیٹھے بابا جان کے متعلق سوچتے رہے تھے۔ بیس سال کی عمر میں باپ بن جانے والے ان کے بابا جان نے اپنی پوری زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دی تھی اور اب ان کی وجہ سے ان کے کندھے چوالیس، پینتالیس سال کی عمر میں ہی جھک گئے تھے۔ ان کی وجہ سے بابا جان نے دکھ اٹھایا تھا اور اب ایک بار پھر انہوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا...... دکھی کر دیا تھا۔ انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش وہ صبر کر لیتے، ضبط سے کام لیتے اور بابا جان کو کچھ نہ بتاتے۔ کچھ دیر پہلے خدا بخش سے باتیں کرتے ہوئے وہ کتنے خوش نظر آرہے تھے...... اور اب کتنے نڈھال اور تھکے، تھکے سے تھے۔ ان کا کتنی ہی بار جی چاہا کہ وہ اٹھ کر بابا جان کے پاس جائیں اُن کے پاس ہی ان کے بیڈ پر لیٹ جائیں اور انہیں یقین دلائیں کہ انہیں اس بات کا کوئی دکھ نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی سے مل نہیں سکتے۔ لیکن وہ اٹھ ہی نہیں سکے...... بس یونہی خالی دل اور خالی ذہن

کے ساتھ بیٹھے رہے تھے۔ کاش انہیں علم ہوتا کہ وہ اس شفیق چہرے کو پھر نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہ محبت سے گندھا وجود ان سے بچھڑنے والا ہے تو وہ کبھی انہیں جانے نہ دیتے یا پھر خود اُن کے ساتھ چلے جاتے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ شفیق چہرہ منوں مٹی تلے چھپ جائے گا۔ یہ محبت بھری آواز پھر کبھی ان کے کانوں میں نہیں آئے گی۔ کاش وہ یہ جانتے ہوتے۔ خدا بخش دودھ رکھ گیا تھا جو پڑے، پڑے ٹھنڈا ہو گیا تھا لیکن وہ یونہی بیٹھے رہے تھے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ان کا جی چاہا تھا وہ اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے بابا جان کے کمرے میں چلے جائیں لیکن پھر ان کی بے آرامی کے خیال سے وہ اپنے کمرے میں آگئے تھے۔ رات بہت دیر سے ان کی آنکھ لگی تھی اور صبح ان کی آنکھ خدا بخش کی چیخوں سے کھلی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ انہیں بلا رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے بابا جان کے بیڈ روم میں آئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے ابدی نیند سو رہے تھے...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

"نہیں......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں بابا جان اس طرح تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ یہ خدا بخش اس طرح کیوں پاگلوں کی طرح چلا، چلا کر رو رہا ہے۔" "خدا بخش......" وہ اتنی زور سے چیخے تھے کہ ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔

"اس طرح کیوں چلّا رہے ہو؟ بابا جان جاگ جائیں گے۔"

اور خدا بخش کی چیخیں اور بلند ہو گئی تھیں۔

وہ بیڈ کی پٹی سے سر پٹخ، پٹخ کر رو رہا تھا۔ اور پھر زمین ان کے پاؤں سے نیچے سے سرک گئی تھی...... وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اور یہ خدا بخش ہی تھا جس نے بابا جان کے دوستوں کو فون کیے تھے۔ گاؤں خبر بھجوائی تھی

اور ان کے دوستوں کی مدد سے انہیں گاؤں لے جانے کے انتظامات کیے تھے۔ وہ تو ہوش میں آنے کے بعد بھی ساکت بیٹھے بابا جان کے بے جان وجود کو تکتے تھے۔ اندر سیلاب اُمڈ رہے تھے اور آنکھوں میں دھول اڑتی تھی۔ یہ خدا بخش ہی تھا جو بار، بار آکر ان کے گلے لگتا، انہیں رُلانے کی کوشش کرتا تھا اور پھر مصروف ہو جاتا۔ بابا جان کو گاؤں لے جا کر قبرستان میں اس چھوٹی سی چار دیواری کے اندر اماں کی قبر کے پاس چھوڑی جانے والی جگہ پر دفن کر دیا گیا تھا اور وہ جیسے قبر کے مجاور ہی بن گئے تھے۔ ماں انہیں یاد نہیں تھی اُن کے لیے سب کچھ بابا جان ہی تھے۔ انہیں کچھ یاد نہیں تھا سوائے اس ٹھنڈی یخ پیشانی کے جس کو انہوں نے آخری بار چوما تھا' ان سرد ہاتھوں کو جنہیں وہ بار، بار ہاتھوں میں لیتے تھے۔ یہ آخری تصویر جیسے ان کی آنکھوں میں منجمد ہو گئی تھی۔ خدا بخش زبردستی انہیں وہاں سے اٹھا کر لاتا، پھپھو ان کی حالت پر کڑھتیں، روتیں اور بابا جان کی طرح ان کا سر سینے سے لگا کر ان کے بالوں کو چومتیں' دلاسا دیتیں۔ لیکن انہیں تو لگتا تھا جیسے بابا جان کے بعد زندگی ان کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ چندا چلی گئی تھی تو بابا جان تھے لیکن اب بابا جان نہیں تھے تو وہ اکیلے ہو گئے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا...... پھر بھی پتا نہیں، وہ کیوں زندہ ہیں...... پتا نہیں اسی حالت میں کتنے مہینے گزر گئے۔ تین ماہ یا شاید چار ماہ...... لاہور سے ایک کولیگ نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ان کی جاب بھی ختم ہو گئی ہے۔ خدا بخش اور پھپھو سمجھاتیں تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ جاتے۔

''بیٹا تمہارے باپ کی روح بے چین ہوگی۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔''

اس روز وہ خدا بخش کے ساتھ دوپہر ڈھلنے کے بعد قبرستان سے گھر آئے تھے اور پھپھو اُن کے انتظار میں برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی تھکے ہارے نڈھال سے تخت پر بیٹھ گئے تھے۔

''تم کوئی ننھے بچے نہیں ہو مدثر، زندگی اور موت کی حقیقت سمجھتے ہو، نہ اللہ سے تمہارا جھگڑا ہے، اس کی چیز تھی اس نے واپس لے لی۔''

وہ جانتے تھے وہ کوئی نوعمر لڑکے نہیں ہیں۔ شادی شدہ اور ایک بچی کے باپ ہیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں دل ٹھہرتا ہی نہیں تھا سکون نہیں ملتا تھا۔

''دیکھو میرے بچے میری بات دھیان سے سنو...... زندگی یوں نہیں گزرتی۔'' پھپھو خلافِ معمول بہت سنجیدہ تھیں۔ ''ہر ایک نے اُدھر ہی جانا ہے۔ یوں تمہارے جوگ لے لینے سے وہ واپس نہیں آئے گا...... میرا بھائی تھا مجھ سے چھوٹا تھا' بچوں کی طرح پیارا تھا مجھے...... ہزار بار کہا تھا اسے تیری ماں کے بعد کہ شادی کر لے...... کر لیتا تو آج تمہارے بہن، بھائی ہوتے، تمہارا دکھ بٹانے کو...... یوں اکیلے نہ ہوتے، تمہارے لیے بھی میں یہ چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو گھر بساؤ اور بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارو۔ تمہارے باپ کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ میں نے خدا بخش کی شادی ایک غریب ہاری کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔ تین روز تک نکاح کر کے لڑکی گھر لے آئیں گے۔ تمہارے بابا جان نے ہی اپنی زندگی میں مجھے خدا بخش کی شادی کے لیے کہہ رکھا تھا۔ بلکہ بات ان کی زندگی میں ہی طے کر دی تھی۔ تم بھی اب سوچو جو فیصلہ کرو...... اگر کہو تو یہاں کوئی لڑکی دیکھوں...... ویسے تمہارے بابا جان نے لاہور میں بھی کوئی لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ خدا بخش نے مجھے بتایا ہے۔ وہاں پہلے پتا کر لیتے ہیں۔''

''جی......'' انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔ ''سوچوں گا پھپھو......'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

یہاں اس گھر میں پھپھو کے دو بیٹے تھے۔ دو بہوئیں تھیں...... سب اچھے اور محبت کرنے والے تھے۔ اتنے مہینوں سے وہ یہاں رہ رہے تھے۔ کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ اپنی طرف سے سب ہی ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آخر کب تک وہ یہاں رہ سکتے تھے۔ اس رات وہ اپنے بستر پر لیٹے تو انہوں نے فیصلہ کیا

کہ وہ خدا بخش کے نکاح کے بعد واپس لاہور چلے جائیں گے۔ اور جب وہ لاہور جانے کے لیے تیار ہوئے تو پھپو افسردہ ہوگئی تھیں۔

''میں نے تمہیں وہ سب اس لیے نہیں کہا تھا کہ تم چلے جاؤ۔ ساری زندگی یہاں رہتے رہو تو ہم پر بوجھ نہیں لیکن بیٹا میں تو تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''جانتا ہوں پھپو، آپ کے سوا اور میرا ہے ہی کون۔ جانا تو تھا ہی پھپو...... بس ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں بابا جان کے بغیر اس گھر میں کیسے رہوں گا۔ اس خیال سے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔''

اور پھپو سے بہت ساری دعائیں لے کر وہ لاہور آگئے تھے...... گھر میں جیسے دھول اڑتی تھی اور اداسی بین کرتی تھی...... ان کے کانوں میں بابا جان کی آوازیں گونجتیں۔

''جانم...... جانِ پدر۔'' تو وہ چونک، چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ لیکن وہ شفیق چہرہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

ان کے آنے کا سن کر بابا جان کے کئی کولیگز ان سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے ہی بابا جان کے واجبات لینے میں ان کی مدد کی تھی۔ وہ سب بابا جان کے دوست تھے۔ ہمدرد تھے اور چاہتے تھے کہ وہ جاب کرلیں۔ ایک دو احباب نے جاب کی تلاش کے سلسلے میں تعاون کا یقین بھی دلایا تھا...... لیکن ان کا دل تو جیسے ہر شے سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ خدا بخش تھا جو بابا جان کے بعد ان کا سایہ بن چکا تھا۔

''صاحب میں کل بیگم صاحبہ کی طرف گیا تھا۔ باتوں، باتوں میں پوچھ لیا ابھی ثنا بیٹی کی کہیں بات طے نہیں ہوئی۔ مونا باجی کسی دوسرے ملک چلی گئی ہیں۔ آپ اجازت دیں تو بی بی جی کو فون کردوں، وہ آکر بات کرلیں؟''
اس روز خدا بخش ان کے کمرے میں دودھ دینے آیا تھا۔

''نہیں......'' انہوں نے سختی سے منع کردیا۔

''تب میں نے بابا جان کی خاطر اقرار کیا تھا لیکن اب جب بابا جان نہیں رہے تو میں کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرکے اس کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنا چاہتا۔ آج کے بعد اس موضوع پر بات نہ کرنا۔''

اور خدا بخش انہیں شاید ان سے زیادہ جانتا تھا اس نے پھر کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ وہ بھی ہولے، ہولے سنبھل گئے تھے۔ خدا بخش اور اس کی بیوی نے گھر سنبھال رکھا تھا اور وہ بے فکر تھے۔ یونہی ڈیڑھ برس بیت گیا۔ اس دوران صرف پھپو کا ہی انتقال نہیں ہوا...... خدا بخش کی بیوی بھی چل بسی...... انہوں نے ایک دو پرائیویٹ کالجز میں جاب کی اور پھر بیزار ہوکر چھوڑ دی...... زندگی گزارنے کے لیے کچھ تو مصروفیت چاہیے تھی...... سو ایک اکیڈمی جوائن کرلی...... معاشی پرابلم فی الحال تو نہیں تھی لیکن خالی وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ اکیڈمی میں دو شفٹیں ہوتی تھیں۔ مصروفیت کے لیے انہوں نے دونوں شفٹوں میں کام شروع کردیا تھا...... خدا بخش کڑھتا۔

''اتنی محنت مت کریں صاحب، صبح کے نکلے شام کو آتے ہیں۔''

''وقت تو کاٹنا ہی ہے ناں خدا بخش۔''

''تو شادی کرلیں۔'' خدا بخش چپکے سے کہہ کر چوری، چوری ان کی طرف تکتا تو وہ نظر چرا لیتے۔

''اس شہر نے ہمیں بہت دکھ دیے ہیں آؤ خدا بخش کہیں اور کسی اور شہر میں جابسیں۔''

اس روز اکیڈمی میں چھٹی تھی اور وہ اندر کی گھٹن سے گھبرا کر لان میں نکل آئے تھے اور خدا بخش بھی لان میں اداس سا بیٹھا تھا۔

''شہر چھوڑ دینے سے کیا ہوگا صاحب، اپنا آپ تو ہر جگہ ساتھ ہی ہوگا ناں۔''

خدا بخش نے کہا تھا لیکن ان کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں شاید وہاں کی فضاؤں میں اتنی اداسی نہ ہو...... اتنی گھٹن نہ ہو...... لیکن کہاں جائیں اور یہ گھر...... بابا جان نے ان کی شادی سے پہلے کتنے شوق سے خریدا تھا...... بالکل نیا تعمیر شدہ یہ گھر مالک مکان نے اس لیے فروخت کر دیا تھا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔ وہ اس گھر کا کیا کریں، فروخت کر دیں یا کرائے پر دے دیں۔ وہ فارغ ہوتے تو سوچتے رہتے تھے۔ اس روز وہ اکیڈمی سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر سڑک کے دوسری طرف ایک پراپرٹی ڈیلر کے بورڈ پر پڑی تو وہ بے ارادہ ہی سڑک کراس کر کے اس پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کی طرف بڑھے تھے اور دفتر سے باہر آتے بیگ صاحب کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ بیگ صاحب ان کے پرانے کولیگ تھے جو اُن کی کالج میں تقرری کے فوراً بعد ہی جاب چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے تھے۔ صرف تین چار ماہ کا ساتھ رہا تھا لیکن بیگ صاحب نے نہ صرف پہچان لیا تھا بلکہ بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔

''آپ تو غالباً انگلینڈ چلے گئے تھے؟'' انہوں نے کہا تو بیگ صاحب نے گہری سانس لی تھی۔

''ہاں گیا تو تھا لیکن سیٹ نہیں ہو سکا۔ جتنا کماتا تھا سب خرچ ہو جاتا تھا۔ بچت بالکل ہی نہیں ہوتی تھی تو سوچا پھر پردیس میں رہنے کا فائدہ۔ یہاں سے چچازاد بھائیوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر گیا تھا۔ سو لاہور آنے کے بجائے کراچی سیٹل ہو گیا۔ والد اور بہن بھی ساتھ ہی ہیں، والد کے کہنے پر ان دنوں آبائی مکان کی فروخت کے سلسلے میں آیا ہوا ہوں۔ گو میں ابھی فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چچازاد بھائی حصہ مانگ رہے ہیں سو رزاق صاحب سے ملنے آیا تھا۔ آپ کس سلسلے میں؟''

''وہ دراصل میں بھی اسی سلسلے میں کچھ معلومات لینے آیا تھا۔ کیا رزاق صاحب آپ کے جاننے والے ہیں؟'' انہوں نے رزاق پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کے دروازے پر ایک نظر ڈالی تھی۔

''ہاں، کافی جان پہچان ہے۔ آپ کو کس سلسلے میں معلومات چاہیے تھیں۔''

''وہ دراصل میں بھی اپنا گھر فروخت کرنا چاہتا ہوں۔'' ان کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا۔

''کیوں خیریت...... آپ کیوں گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ نے چند سال پہلے ہی وہ گھر خریدا تھا۔ کیا کہیں اور گھر لے لیا ہے۔''

تب انہوں نے بیگ صاحب کو اپنی شادی ٹوٹنے اور بابا جان کی وفات کا بتایا تھا کہ ان کا دل اس شہر سے اچاٹ ہو چکا ہے اور وہ کہیں کسی اور شہر میں جا کر رہنا چاہتے ہیں۔ تب بیگ صاحب نے انہیں کراچی آنے کا مشورہ دیا تھا...... اور انہیں بھی بیگ صاحب کی بات پسند آئی تھی اور پھر بیگ صاحب سے ان کی تین چار اور ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ کراچی واپس جانے سے پہلے بھی بیگ صاحب ان سے ملے تھے اور انہیں تاکید کی تھی وہ کہیں اور جانے کے بجائے کراچی آئیں۔

''کراچی بڑا بادشاہ شہر ہے مدثر صاحب، آپ کو محسوس بھی نہیں ہوگا کہ آپ کسی اجنبی شہر میں ہیں۔'' انہوں نے اپنا فون نمبر دیا اور ان کا لے لیا تھا...... بیگ صاحب سے ان کی کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ چند ماہ کے ساتھ میں صرف دعا سلام ہی تھی لیکن ان کے خلوص سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ جتنی بار بھی ملے بہت محبت اور خلوص سے ملے اور ان کی بے حد دلجوئی کی بلکہ کراچی میں ایک پرائیویٹ کالج میں ان کے لیے جاب کا بندوبست بھی کر دیا۔

''فی الحال یہ جاب کر لیں جب گورنمنٹ کی جابز نکلیں تو اپلائی کرتے رہیے گا۔''

انہوں نے کہا تھا اور پھر فوراً ہی مکان کا گاہک بھی مل گیا۔ انہوں نے فرنشڈ گھر کا سودا کیا تھا۔ اس روز خدا بخش بلک بلک کر رویا تھا۔ وہ ایک، ایک چیز کو دیکھتا اور روتا تھا۔ انہوں نے اسے ضروری چیزیں پیک کرنے

کے لیے کہا تھا لیکن خدا بخش کا جی چاہتا تھا وہ ہر وہ چیز ساتھ لے جائے جسے بابا جان نے بہت شوق سے خریدا تھا۔ کبھی وہ بابا جان کے کمرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ کبھی لاؤنج میں آکھڑا ہوتا، کبھی لان کو حسرت سے دیکھتا...... وہ خدا بخش کی دلی کیفیات کو سمجھ رہے تھے۔ خود ان کے دل کی حالت بھی خدا بخش سے کچھ مختلف نہ تھی۔ تب ہی گھبرا کر انہوں نے خدا بخش سے کہا تھا۔

''آؤ خدا بخش جانے سے پہلے بابا جان کی قبر سے ہو آئیں پھر جانے کب آنا ہو۔''

ان کا ارادہ چند دن گاؤں رہنے کا تھا۔ یوں بھی انہیں دو ہفتے تک گھر خالی کر کے چابی مالک مکان کو دینی تھی...... سو وہ خدا بخش کے ساتھ گاؤں آ گئے تھے...... ابھی انہیں گاؤں آئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ پھپوزاد بھائی کے سسر وفات پا گئے پھوپی زاد بھائی کا سسرال خانیوال میں تھا...... اب جبکہ وہ گاؤں میں ہی تھے تو انہیں مناسب نہ لگا کہ وہ گاؤں میں رکے رہیں اور جنازے میں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ وہ خدا بخش کو لے کر پھوپی زاد بھائیوں کے ساتھ خانیوال چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنازہ پڑھ کر وہاں سے ہی لاہور چلے جائیں گے سو ان لوگوں کے روکنے کے باوجود وہ نہیں رکے تھے اور عشا کے بعد ہی لاہور کے لیے چل پڑے تھے گو خدا بخش نے بھی کہا تھا کہ اب رات کو سفر کرنا کیا ضروری ہے۔ لیکن ان کا دل سخت گھبرا رہا تھا۔

''نہیں یار چلتے ہیں۔ رات اپنے گھر میں ہی جا کر آرام کریں گے۔''

''اپنا گھر کہاں رہا صاحب، وہ تو اب دوسروں کا ہے۔'' خدا بخش بہت دلگرفتہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خود بھی افسردہ ہو گئے تھے سو خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ انہیں ڈرائیو کرتے ہوئے پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ دو گھنٹے یا کچھ زیادہ...... اچانک انہوں نے بریک پر پاؤں رکھا۔

''یا اللہ خیر!'' خدا بخش بڑبڑا رہا تھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں شاید انجن گرم ہو گیا ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے۔ یہ ایک ویران سی روڈ تھی۔ آس پاس، ادھر اُدھر کہیں کوئی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ انہوں نے ڈگی سے پانی کی بوتل نکالی۔ خدا بخش بھی باہر نکل آیا تھا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ انہوں نے بونٹ اٹھایا۔

اتنی دیر میں صرف ایک ٹرک اور ایک چھکڑا سی بس وہاں سے گزری تھی اور نہ تو ٹرک اور نہ ہی بس رکی تھی۔

''انسانیت تو نام کو باقی نہیں رہی کیا مجال کہ سواری روک کر پوچھ لیں کہ مدد کی ضرورت تو نہیں۔'' خدا بخش...
بڑبڑا رہا تھا۔

''لوگ ڈرتے ہیں خدا بخش......'' انہوں نے خدا بخش کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ایک ہم بہت بہادر ہیں ناں جو آدھی رات کو اٹھ کر چل پڑے ہیں۔ اس وقت تو ان ویران جگہوں پر شر شرار بھی ہوتے ہیں۔ جلدی کریں صاحب۔'' وہ سڑک کے دائیں طرف اندھیرے میں گھور رہا تھا پھر یکایک اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

''صاحب...... وہ...... وہ اُدھر......'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''بابا......'' رواحہ نے انہیں پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے لیکن ان کا ذہن ابھی تک پیچھے کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

''بابا......'' رواحہ نے پھر بلایا۔

''آپ کس سوچ میں گم ہیں۔ ٹھیک تو ہیں ناں......''

''ہاں......'' انہوں نے ہولے سے سر جھٹک کر خالی گلاس خدا بخش کی طرف بڑھایا۔

''ٹھیک ہوں، بس کچھ تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے چلتا ہوں رات کو آؤں گا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بابا میں نے آپ سے کہا تو ہے ناں کہ رات کو مت آیئے گا۔ بے فکر ہو کر آرام کریں میں اور جواد ہوں گے ناں اِدھر......'' عظام نے کہا۔

انہوں نے سر ہلایا اور خدا بخش کو چلنے کا اشارہ کر کے ارتفاع کی طرف بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''اللہ حافظ بیٹی، انشاء اللہ جلد ہی آپ کے گھر حاضر ہوں گے۔''

ارتفاع کی پلکیں جھک گئیں اور چہرے پر سرخی سی بکھر گئی۔ انہوں نے دلچسپی سے اس کے رخساروں پر پھیلتی شفق کو دیکھا اور پھر رواحہ کو مخاطب کیا۔

''اچھا اللہ حافظ بیٹا۔''

''اللہ حافظ......'' رواحہ نے جواب دیا۔ ''پریشان مت ہوئیے گا بابا اور سکون سے سو جایئے گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق......'' عظام نے جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی تو رواحہ نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''چلیں بابا میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ آتا ہوں۔''

''ارے نہیں بیٹا بیٹھو تم۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر عظام کو روکا اور ساتھ ہی اُن کی نظر اس پر پڑی، اس کے لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی اور وہ مسکراتی نظروں سے رواحہ کو دیکھ رہا تھا اور رواحہ کے لبوں پر بھی مبہم سی مسکراہٹ تھی تب انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ عظام کیوں انہیں پارکنگ تک چھوڑنے جانا چاہتا تھا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاپا شام کو آئیں گے؟'' عظام کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''ہاں پاپا نے کہا تو تھا آنے کو۔''

''تو تم انہیں ظفری کے متعلق بتا دینا۔ پریشان ہو رہے تھے وہ تم دونوں کو باہر بھیجنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''ہاں پاپا بھی آپ کی طرح پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ ظفری وغیرہ سے پنگا لینے کے حق میں نہیں تھے۔''

''حالانکہ دیکھنے میں اور بات چیت سے وہ بہت جی دار آدمی لگتے ہیں۔''

''ہاں ہیں تو......لیکن اولاد کے معاملے شاید سب ہی کمزور پڑ جاتے ہیں۔'' عظام نے خیال ظاہر کیا تب ہی خدا بخش کو اچانک یاد آیا۔

''ارے صاحب وہ جو لڑکی گھر نہیں آئی تھی کیک لے کر اپنی والدہ کے ساتھ کیا نام تھا وہ ملکہ نور جہاں......''

''نور جہاں نہیں شاہجہان بیگم۔'' عظام کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں، ہاں وہی۔''

''کیا ہوا اس لڑکی کو؟'' عظام کی بے چینی کو انہوں نے کسی قدر حیرت سے دیکھا۔

''ہونا کیا ہے صاحب......وہ لڑکی اور اس کی بہن آئی تھیں رواحہ صاحب کی خیریت معلوم کرنے۔''

''انہیں کیسے پتا چلا؟'' انہیں حیرت ہوئی۔

''پتا نہیں صاحب، میں گیٹ کے باہر بیٹھا تھا تو مجھ سے رواحہ صاحب کا پوچھا تھا۔ شاید کہیں سے سن لیا

ہو۔ آس پاس سب گھروں کو تو پتا ہی ہے رواحہ صاحب کے حادثے کا بس گولیاں لگنے کی بات کسی سے نہیں کی میں نے۔''

اور وہ خدا بخش سے کچھ کہتے، کہتے خاموش ہو گئے

''کہہ رہی تھیں کہ ان کی والدہ لاہور سے آجائیں تو وہ رواحہ صاحب کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جائیں گی۔''

''تو ابھی تک وہ لاہور سے نہیں آئیں؟'' عظام کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

انہیں عظام کی بے ساختگی پر جیسے کوئی ادراک ہوا تھا..... وہ عظام اور خدا بخش سے چند قدم آگے ہو گئے تھے جبکہ عظام آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے خدا بخش سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

شاہجہان بیگم لاؤنج میں صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھیں اور نیچے کارپٹ پر بیٹھی موراں اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ جب ظہورے نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

''کیا آفت آ گئی ہے شاہجہان بیگم جو کچی نیند سے جگا کر بلو بھیجا۔'' ظہورے کا موڈ خراب ہو رہا تھا، آنکھوں میں کچی نیند سے جاگنے کی سرخی نمایاں تھی۔

''انگارے کیوں چبا رہا ہے، جگایا ہی ہے ناں لام پر تو نہیں بھجوا رہی۔'' وہ بھی شاہجہان بیگم تھیں انہیں ظہورے کا لہجہ اور بات تیر کی طرح لگی تھی۔

''تجھے پتا تو ہے ناں ٹرین میں کیسی بے آرامی رہی اور اب یہاں آئے بھی چار گھنٹے ہو گئے کروٹیں بدل، بدل کر جسم دکھنے لگا تب کہیں جا کر ذرا آنکھ لگی تھی کہ تیرا حکم نامہ پہنچ گیا۔'' شاہجہان کے غصے اور ناراضی کے خیال سے ظہورے کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

''تو جا دفعان ہو، جا کر نیند پوری کر، شیدا کمبخت پتا نہیں کہاں مر گیا آئے تو بھیج دینا۔'' شاہجہان بیگم کے لہجے پر ظہورا چونکنا ہوا۔

''ارے موراں بھیج اسے۔ کہیں باؤلا ہو کر کاٹنے ہی نہ لگ جائے۔'' شاہجہان بیگم نے موراں سے کہا تو ظہورے کو لگا کہ شاہجہان بیگم کہیں سچ مچ ناراض نہ ہو جائے۔

''توبہ ہے شاہجہان بیگم غصہ تو تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اب کس کمبخت کو نیند آئے گی، بول کیوں بلوایا تھا۔ لاہور سے کراچی تک تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھی رہیں اور اب کام یاد آ گیا۔'' ظہورے کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔ شاہجہان بیگم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے موراں کو ڈپٹا۔

''کیا ہاتھوں میں جان نہیں رہی کمبخت ٹھیک طرح سے دبا۔ چل، چل کر ٹانگوں میں گلٹ پڑ گئے۔''

ظہورے نے دلچسپی سے شاہجہان بیگم کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اور وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اب کھڑا منہ کیا تک رہا ہے، دفعہ ہو جا کر سو مر۔'' شاہجہان کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

''ایمان سے شاہجہان بیگم جب تو ناراض ہوتی ہے ناں تو مت پوچھ دل پر کیا گزرتی ہے۔ جانتی تو ہے نیند کا کچا ہوں، اب بول بھی کیوں بلایا تھا۔'' اس نے جان لٹاتی نظروں سے شاہجہان بیگم کو دیکھا۔ تو شاہجہان بیگم نے بھی مزید غصہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''سن کوئی آئے تو باہر سے ہی ٹال دینا، کہہ دینا لاہور میں ہی ہوں اور صاحبزادہ صاحب کو تو بھنک بھی نہیں

ملنی چاہیے میرے آنے کی۔ شیدے کو اور دوسروں کو بھی سمجھا دے۔''
''کب تک؟'' ظہورے نے ذرا سی آنکھیں میچ کر اسے دیکھا۔
''جب تک ممکن ہو کم از کم ہفتہ بھر تو صاحبزادہ صاحب کو میرے آنے کی خبر نہیں ہونے پائے۔''
''آخر مسئلہ کیا ہے؟ منہ سے کچھ پھوٹ تو۔''
''تجھے کیا مسئلے سے......بس جتنا کہا ہے اتنا کر۔''
''میں تو اتنا ہی کروں گا پر تم نہ بھید دینا کبھی اپنے من کا۔'' ظہورا بڑبڑایا۔
''ارے کون سا بھید چھپا رکھا ہے میں نے۔'' شاہجہان بیگم نے اسے گھورا۔
''یہ تو تم جانو کیا بھید ہے، بھاگم بھاگ لاہور پہنچیں... وہاں کی سڑکیں ناپ کر لشتم پشتم واپس......آخر کچھ تو ہے ناں......اس آنے جانے میں۔''
''ایسے ہی گئی تھی گھر بار دیکھنے......عمر گزری اس شہر میں......گلی میں......دل چاہا دیکھ آؤں۔''
''یہ بات کسی اور سے کہنا، ظہورا تمہیں اچھی طرح جانتا ہے اس آنے جانے میں کچھ تو بھید چھپا ہے۔'' ظہورے کو بھی شاہجہان سے تکرار کر کے مزہ آتا تھا حالانکہ جانتا تھا کہ شاہجہان بیگم کچھ نہ بتانا چاہے تو کوئی اس کی زبان نہیں کھلوا سکتا۔
''ہاں چھپا ہے تو پھر، تجھے کیوں اتنی کرید لگی ہے۔'' شاہجہان نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔
''سچ بتا حاتی دادا کو ڈھونڈنے گئی تھی ناں؟'' ظہورے نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا......اور آنکھیں کچھ جان لینے کے انداز میں گھما رہا تھا۔
''یہ ظہورا کمبخت بھی بڑا کائیاں ہے۔'' شاہجہان نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اسے گُھرکا۔
''یہ دیدے کیوں مٹکا رہا ہے، بتا تو دیا تجھے۔''
''سچ نہیں بتایا......اور کبھی بتاؤ گی بھی نہیں، جانتا ہوں دل میں تیرے کون بستا ہے۔'' یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ اس کے دل میں تو بس ایک ہی نقش کھدا تھا۔ ایسا گہرا اتنا پائیدار کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی ایسا ہی تھا۔ وہ پہلی نظر کی گھائل تو نہیں تھی لیکن دوسری نظر نے اسے گھائل کر دیا تھا۔ وہ طیفے بدمعاش کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اور چھت پر لٹکے فانوس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی پہلا مرد نہیں تھا، وہ سولہ سال کی عمر میں اس چوبارے پر آئی تھی اور سیکڑوں مردوں کو اس نے دیکھا تھا۔ لیکن یہ مرد جو طیفے کے کندھے پر ہاتھ رکھے دھیمے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا اس میں ایسا کیا خاص تھا کہ شاہجہان بیگم کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا تھا۔ اس روز کے بعد اس نے کبھی حاتی دادا کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا لیکن دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی اس کی تصویر تو دل پر نقش ہو گئی تھی۔
''کب تک انتظار کرے گی اس کا......اب نہیں آنے والا وہ......'' ظہورے کا موڈ بدلا تھا اور لہجے میں شوخی در آئی تھی۔ ''نکاح کے دو بول پڑھا لے مجھ سے۔''
''زیادہ بک، بک نہ کر۔'' شاہجہان بیگم نے چونکتے ہوئے اسے گُھرکا۔
''ہاں، کام کی بات تو ہمیشہ بک، بک ہی لگتی ہے تجھے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔
موراں سر نیچا کیے مسکرا رہی تھی۔ سالوں سے وہ ظہورے کی چہلیں اور شاہجہان بیگم کی نوک جھوک دیکھتی آ رہی تھی۔ نہ شاہجہان بیگم اسے دھتکارتی تھی نہ سر کا تاج بناتی تھی۔ اب پتا نہیں ظہورا سچ مچ شاہجہان کا طلب گار تھا یا چھیڑتا تھا اسے۔
''اب زبان کو لگام دے گا یا جوتا نکالوں پاؤں سے۔'' شاہجہان بیگم نے پاس پڑا پاندان اٹھا کر گود میں رکھا

اور کھٹاک سے کھولا۔

''شاہجہان بیگم!'' ظہورا ایک دم سنجیدہ ہوا۔ ''قسم رب سوہنے کی ظہورا قول کا کچا نہیں ہے۔ اپنی پریشانی بول تیری پریشانی دور کر کے ہی تجھے منہ دکھاؤں گا۔''

''جانتی ہوں۔'' شاہجہان کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔ ''جب ایسی ضرورت پڑی تو تجھے ہی بتاؤں گی اور کون ہے اپنا۔''

''سب کچھ کہنا پر حاتی دادا کو ڈھونڈنے کا نہ کہنا۔ قسم سے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔'' اس نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

''پھر شروع ہوگئی تیری بک، بک......'' شاہجہان نے غصے سے کہا لیکن آنکھوں کا تاثر نرم ہی تھا۔

''تم ایسی پریشان تو کبھی نہیں ہوئی تھیں شاہجہان۔'' ظہورا دیوار سے ہٹ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔

''میں تو سمجھا تھا تو ریکھا اور زرینہ کی شان بان دیکھنے گئی ہے پر تو دو گھڑی جا کر اُدھر بیٹھی تک نہیں...... دال میں کچھ تو کالا ہے۔''

''دفع دور......'' شاہجہان نے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''مجھے کیا ان کی تام جھام سے۔''

''اچھا تو کیا صاحبزادہ صاحب مکر گئے خرچہ دینے سے اور تم واپس جانے کا سوچ رہی ہو؟'' ظہورا ابھی اڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا۔

''بس کر دے ظہورے اندازے لگانا...... اور میرا دماغ نہ کھا...... جو کہا ہے باہر جا کر سب کو سمجھا دے کچھ بتانے جوگا (لائق) ہوا تو تجھے بتا دوں گی۔'' شاہجہان یک دم ہی ظہورے کی گفتگو سے بیزار ہو کر پہلے سے کٹی ہوئی چھالیا سروتے سے پھر کاٹنے لگی اور ساتھ ہی ٹانگیں پیچھے کرلیں۔

''بس کر موراں جا کر ایک کپ چائے بنا لا۔ دماغ پولا (پلپلا) کر دیا ہے اس کی بک، بک نے۔''

ظہورا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، مزاج آشنا تھا...... جانتا تھا اب شاہجہان کچھ نہیں بولنے والی۔ سو خاموشی سے لاؤنج سے نکل گیا۔ شاہجہان نے اسے باہر جاتے دیکھا...... لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ اسے ظہورے کی وفاداری پر شک نہیں تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کس الجھن میں پھنسی ہوئی ہے اور ظہورا ابھی بھلا کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔ ظہورا تو الٹا اس کی بات سن کر ہنسی اڑاتا کہ کیسا عہد، کہاں کا عہد لیکن وہ تو خود کو کسی کے ساتھ کیے عہد کا پابند پاتی تھی۔ تھی تو وہ کوٹھے والی...... معاشرے کی نظر میں ناقابلِ اعتبار...... اگر جو عہد کی پاسداری نہ کرتی تو کون پوچھتا اور پھر جو پوچھ سکتا تھا اسے خبر بھی کیا تھی لیکن وہ تو جیسے اس وعدے کی نادیدہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ کبھی جو خیال آتا بھی کہ وہ تو اس کے وجود سے ہی بے خبر ہے تو اگر میں وعدہ توڑ دوں تو...... اور کانوں میں وہ بھاری گمبھیر آواز گونجنے لگتی۔

''سنو شاہجہان بیگم آج نشے میں جو غلطی ہوگئی اس کا اگر کوئی نتیجہ نکلا تو وعدہ کر مجھے خبر کر دے گی۔''

''خبر کر دی تو بھلا تو کیا کرے گا؟''

''قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے رب کی اسی وقت تجھ سے نکاح پڑھا لوں گا اپنی اولاد کو کوٹھے پر پروان نہیں چڑھنے دوں گا۔''

اور وہ لحہ بھر کو چپ سی ہوگئی تھی۔

''اور اگر میں مر کھپ گیا تو وعدہ کر میری اولاد کو کوٹھے سے دور رکھے گی۔ لڑکی ہوئی تو جوان ہوتے ہی کسی شریف آدمی سے شادی کر دینا، لڑکا ہوا تو کسی یتیم خانے میں چھوڑ آنا پل جائے لیکن یہاں رکھ کر

(گالی) مت بنانا اسے۔"

"اور اگر آج میں وعدہ کر بھی لوں اور کل مکر بھی جاؤں تو تمہیں کیسے پتا چلے گا...... میں تمہیں خبر ہی نہیں کروں کہ میں تمہاری اولاد کو جنم دینے والی ہوں تو؟" وہ ہنسی تھی۔

"مجھے تم پر یقین ہے، شاہجہان بیگم کہ تم میرا یقین نہیں توڑو گی۔"

"ارے ہم جیسوں پر یقین نہیں کرتے دادا۔" وہ پھر ہنسی تھی۔

"کیا خبر میں بیٹی کی ماں بن جاؤں تو بیٹیاں تو ہمارے چوباروں کی رونق ہوتی ہیں۔"

اور وہ لحہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا۔

"تم میری بیٹی کو اپنے چوبارے کی رونق نہیں بناؤ گی، شاہجہان بیگم مجھے یقین ہے تم پر۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"وعدہ کرو۔"

"وعدہ!" اس نے اپنا ہاتھ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور اس نے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

"میں ہر ایک پر یقین نہیں کرتا شاہجہان بیگم لیکن تمہارے وعدے پر یقین ہے مجھے۔"

اور اس کے اس یقین نے اس لمحے کچھ ایسا اس کے دل کو اپنے شکنجے میں کسا تھا کہ وہ آج تک اس یقین کو توڑنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی حالانکہ کب، کب دل نے اکسایا نہیں تھا۔

جب دائی نے تصدیق کردی تھی کہ وہ دوسرے جی سے ہے تو اس نے اسے بتایا نہیں تھا...... اس نے کہا تھا کہ خبر ملی تو اسی وقت نکاح پڑھا لوں گا اور اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تھا، اپنے چوبارے کو دیکھا تھا۔ موتیا تھی، سنہری تھی اس کی اپنی بیٹیاں اور دوسری لڑکیاں تھیں بھرا چوبارا کیسے چھوڑ دیتی۔ یہ تو بہت دنوں بعد اسے خیال آیا تھا کہ اگر نکاح نہ کرنا چاہوں تو کوئی زبردستی تو نہیں ہے...... بس کہوں گی اپنی اولاد کا خرچہ دے ڈاکٹر، اسپتال کا اور پھر لے جا اپنے ساتھ...... تب وہ اس کے گھر پہنچی تو یہ بڑا سا تالا دروازے پر لگا تھا پتا چلا چند دن پہلے کہیں گئے ہیں۔ تین چار بار شیدے کو بھی پتا کرنے بھیجا اور پھر خاموش ہوکر بیٹھ گئی تھی کہ اب ہواؤں کو تو خبر نہ کرسکتی تھی کہ اسے جا کر بتا دیں۔ اور جب وہ اس کی گود میں آئی تھی تو اس کی موہنی صورت دیکھ کر دل کھل اٹھا تھا۔ یہ چاند جب میرے چوبارے میں چمکے گا تو دھوم مچ جائیں گی اور کئی دن تک وہ ساری گلی والیوں کی مبارک بادیاں وصول کرتی رہی تھی۔

"ارے یہ تو موتیا، سنہری سب کو مات کر جائے گی، تیری تو لاٹری نکل آئی ہے۔" گلی والیاں کہتیں تو وہ اندر ہی اندر فخر سے پھول جاتی لیکن پھر ایک رات وہ بستر پر لیٹی تو جیسے سماعتوں میں ایک ہی آواز گونجنے لگی۔ بھاری گمبھیر آواز......

"مجھے تم پر یقین ہے شاہجہان تم میری اولاد کو......" اور وہ اس آواز سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی...... پہلے کانوں پر ہاتھ رکھے پھر انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں لیکن یہ آواز تو اس کی سماعتوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھی...... اور پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"ہاں، میں اس کا یقین نہیں توڑ سکتی۔"

اس نے پاس لیٹی بجل کو دیکھا...... اور اس کا دل بجھ گیا۔ یہ چاند اس کے چوبارے پر چمکنے کے لیے تو اس کی گود میں نہیں اتارا گیا تھا۔ وہ تو محض اس کی امین تھی، اسے امانت اس کے مالک تک پہنچانی تھی سو صبح ہوتے ہی اس نے شیدے کو دوڑایا لیکن بے سود...... شیدے نے آکر یہی بتایا کہ اُدھر بدستور تالا لگا ہوا ہے۔ تب وہ خود ہی ایک ماہ کی بجل

کو اٹھائے پتا کرتے اکیلی ہی اس کے محلے میں پہنچ گئی تھی۔ آس پاس والوں سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں گئے کسی کو علم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ لوگ گھر فروخت کر کے چلے گئے ہیں۔ سب کو ہی ان کے جانے کا افسوس تھا اور سب ہی ان کی تعریف کرتے تھے۔ سب نے اسے بھی کوئی مصیبت زدہ سمجھا تھا جو مدد مانگنے آئی تھی...... اور وہ یونہی بجل کو اٹھائے ناکام واپس آ گئی تھی۔ بس ذرا سی چوک ہو گئی تھی اس سے اگر وہ اس روز اسے خبر کر دیتی جب اسے پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو یہ وعدہ اس کے دل کو اب تک نہ جکڑے ہوتا، بس وہ جو اس وقت اس کے دل میں ذرا سی بے ایمانی آئی تھی اس پر وہ ہمیشہ پچھتاتی رہی اور بجل کو کوٹھے کی سرگرمیوں سے دور رکھ کر وعدہ نبھایا۔ جب چوبارہ یک دم خالی ہو گیا گلابو ہیضے سے مر گئی۔ مینو نے کسی تانگے والے سے شادی کر لی...... فارا کو ٹی بی ہو گئی تو سب نے کتنا کہا بجل کو بھی سنہری کے ساتھ ابھی سے سیکھنے پر لگا دو تا کہ بڑھاپے کا آسرا ہو جائے...... ایک بار تو اس نے استاد جی سے کہہ بھی دیا کہ جب سنہری کو تعلیم دیتے ہیں تو بجو بھی ساتھ بٹھا لیا کریں۔ تھوڑا بہت سُروں کی پہچان ہو جائے گی لیکن پھر خود ہی منع کر دیا وہ کبھی خود کو یقین کی ان زنجیروں سے آزاد ہی نہیں کر سکی جو اس نے ایک کوٹھے والی پر کیا تھا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بجل کے پاؤں میں گھنگرو نہیں باندھے گی۔

''تو کیا پڑھا لکھا کر استانی بنائے گی؟'' ظہورا منہ چڑھا تھا جو دل میں آتا کہہ دیتا تھا۔

''نہیں کوئی شریف آدمی دیکھ کر شادی کروں گی اس سے۔'' اور اس کی بات پر ظہورے کو اس زور سے ہنسی آئی تھی کہ اس کے حلق میں پھندا لگ گیا تھا۔

''شاجہان بیگم لگتا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے، کیا کوئی شریف آدمی تیری اس گلی میں تیرے چوبارے پر بیاہنے آئے گا تیری لاڈلی کو؟''

ظہورا غلط تو نہیں کہہ رہا تھا لیکن وعدہ لینے والا شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ کوٹھے پر پلنے والی کے ساتھ کوئی شریف آدمی شادی نہیں کرے گا بھلے وہ کتنی بھی پاکباز کیوں نہ ہو۔ تو تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بجل کو ایکٹریس بنائے گی، عزت بھی ملے گی پیسہ بھی...... وہاں کسی نے نہیں پوچھنا کہ کہاں سے تعلق ہے اور کیا خبر کوئی اچھا آدمی اس سے شادی کر لے اور وہ اس کے سامنے سرخرو ہو جائے کہ اس نے اس کا یقین نہیں توڑا...... آخر اس کی گلی سے شوبز میں جانے والی دو لڑکیوں کی شادی ہو ہی گئی تھی شریف خاندانی لڑکوں سے...... تو اسی لیے اس نے لاہور چھوڑا تھا۔ حالانکہ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کراچی جانے کو لیکن صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا اب لاہور میں فلمیں نہیں بنتیں البتہ کراچی میں ڈرامے بہت بنتے ہیں، پہلے ڈراموں میں کام کر لے پھر کبھی کوئی فلم بنی تو فلم میں کام کر لے گی تمہاری بیٹی...... اور صاحبزادہ صاحب سے بجو کا ذکر کر کے بڑی غلطی ہو گئی تھی اس سے وہ بجو کو کام تو کیا دلواتے اسے دیکھتے ہی خود لٹو ہو گئے تھے۔

''تم ایک سال کے لیے بجل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ ہم ملک سے باہر رہیں گے۔ واپس آ کر پھر فلم شلم کرتی رہے گی۔''

''لیکن صاحبزادہ صاحب آپ نے تو دس سال تک موتیا کا خرچ اٹھانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''تو موتیا کا خرچ اٹھاتا رہوں گا میں...... اس سے کب انکار ہے مجھے...... گھر کا کرایہ، ماہانہ خرچ سب پہلے کی طرح تمہیں ملتا رہے گا۔ کیا کروں تیری بجل پر دل آ گیا ہے۔''

''تو صاحبزادہ صاحب اپنی بجو سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں۔''

صاحبزادہ صاحب بھی تو شریف اور خاندانی ہی کہلاتے تھے۔ بجل سے شادی کر لیتے تو وہ اس وعدے کے بوجھ سے بھی آزاد ہو جاتی۔

''کیا کہا تم نے شاہجہان بیگم؟ سجو سے شادی کرلوں؟'' صاحبزادہ صاحب کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئی تھیں اور لبوں پر ایک تمسخر اڑاتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''ہم خاندانی لوگ ہیں اور شادیاں، نکاح ہم خاندانوں میں ہی کرتے ہیں۔ پندرہ بیس دنوں کے لیے اپنے علاقے میں جارہا ہوں واپس آکر سارے معاملات طے کرلیں گے۔''

صاحبزادہ صاحب تو فیصلہ سنا کر چلے گئے تھے اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سجل پر نظر پڑی تو کانوں میں وہی بھاری گمبھیر آواز گونجنے لگی۔

''وعدہ کر شاہجہان میری اولاد کو اپنے کوٹھے کی زینت نہیں بنائے گی۔'' اور وہ بھاگم بھاگ لاہور آئی شاید تب دل لگا کر نہیں ڈھونڈا تھا۔ اندر کہیں کوئی چور تھا لیکن اب اس نے محلے کا ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا، شاید کسی سے کوئی گہرا تعلق ہو، کسی سے ملنے آیا ہو، کسی کو خبر ہو کچھ...... لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کچھ تو نام تک نہیں جانتے تھے۔ کچھ پرانے باسی تھے تو لیکن بے خبر تھے۔ وہ تو وحدت روڈ والے مکان تک بھی ہو آئی تھی۔ آس پاس سے بھی پوچھ لیا...... تو مایوس ہو کر گھڑی دو گھڑی کے لیے ریکھا کے پاس آبیٹھی تھی اور ریکھا نے اسے بتایا کہ وسوا سے ڈھونڈتا پھر رہا تھا...... وسوا اسی گلی کی پیداوار تو تھا لیکن جوانی میں قدم رکھتے ہی چلا گیا تھا۔

''تیرا پتا پوچھا تھا مجھ سے...... میں نے تو انکار کردیا تھا پر تیری پکی سہیلی نے دے دیا۔''

''یہ وسو کمبخت کو مجھ سے کیا کام آپڑا۔ کمبخت کہیں کا، زمانے بھر کا جھوٹا، دغاباز۔''

''کسی امانت کی بات کررہا تھا۔'' ریکھا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ارے میں اس کی کون سی امانت دبائے بیٹھی ہوں۔''

وہ بھڑکی تھی لیکن پھر یکایک چونکی تھی اور ریکھا کے اصرار کے باوجود رکی نہیں تھی اور اگلے دن ہی واپس کراچی آنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ ظہورا بہت بزبز ہوا تھا۔

''اب آئے ہیں تو چار دن ٹک جا...... قسم سے ان رونقوں کے لیے ترس گیا تھا۔ نہ ایسے پان وہاں اور نہ...... ویسے سنا ہے ایک ٹھیکدار اکثر مال لے کر آتا ہے بنگالی اور روسی بھی...... شاید تیرا کام بن جائے۔''

''تو رہ جا تو یہیں...... کسی نہ کسی در سے روٹی تو مل ہی جائے گی۔'' شاہجہان بیگم کا لہجہ بظاہر بے حد سادہ اور عام سا تھا لیکن آگے بھی ظہورا تھا۔

''ارے شاہجہان بیگم ہم تو جس در پر بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔ اب تو مر کر ہی وہ در چھوڑے گا۔''

موراں نے آکر چائے اس کے سامنے تپائی پر رکھی اور اس کی طرف دیکھا۔

''جب سے آئی ہو بیٹھی ہو، چائے پی کر دو گھڑی آرام کرلو۔''

''ہاں......'' وہ چونکی اور چائے کا کپ اٹھالیا۔

''موراں......'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھلا اور رشیدا ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

''ارے کیا ہوا شیدے...... کیا کتے پیچھے لگے ہیں۔'' شاہجہان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''نہیں شاہجہان بیگم وہ...... وہ حاتی دادا......''

''کیا......؟''

چائے شاہجہان بیگم کے ہاتھوں میں چھلک گئی اور وہ حیران سی شیدے کو دیکھنے لگی۔

(جاری ہے)